اترپردیش اردواکادمی
उत्तर प्रदेश उर्दू अकादमी

خبرنامہ

ماہنامہ اُترپردیش اُردواکادمی لکھنؤ

اکتوبر ۲۰۲۳ء

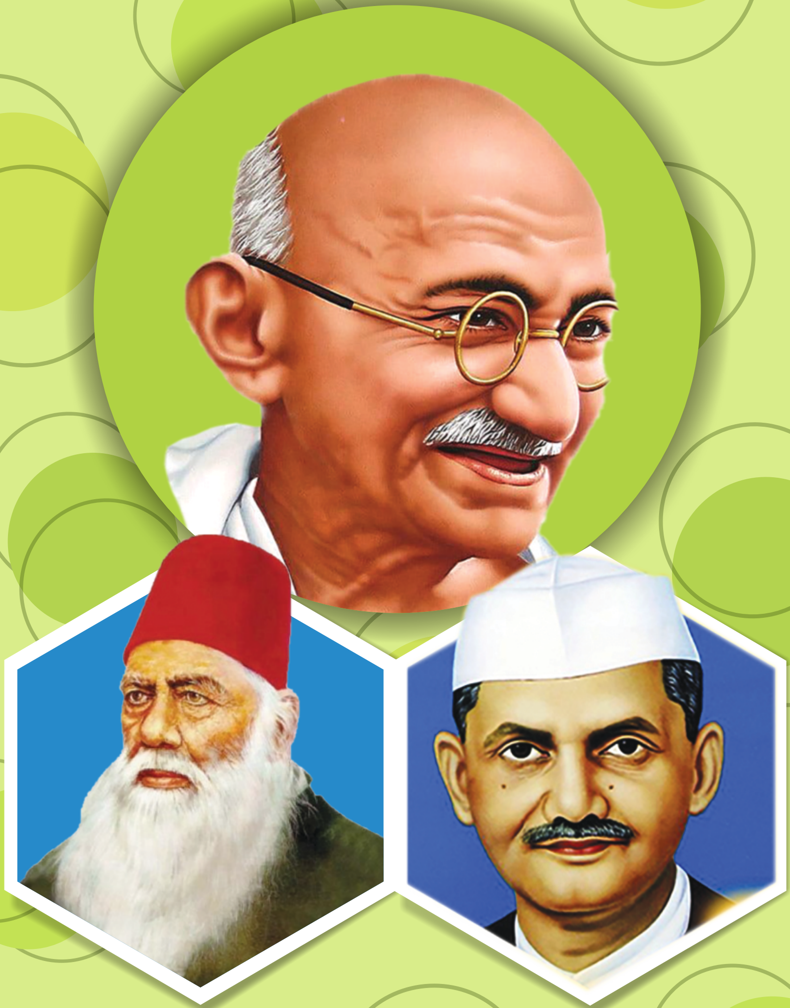

اتر پردیش اردو اکادمی

خبرنامہ

جلد : ۵۲ اکتوبر ۲۰۲۳ء شمارہ : ۴

ایڈیٹر : **شوکت علی** (سکریٹری)

معاون : **محمد معاذ اختر احسن** (سپرنٹنڈنٹ)

زرسالانہ : پچاس روپے -/50
قیمت فی شمارہ : پانچ روپے -/5

upurduakademi3@gmail.com
www.upurduakademi.in

خط وکتابت وترسیل زر کا پتہ

سکریٹری، اتر پردیش اردو اکادمی، وبھوتی کھنڈ،
گومتی نگر لکھنؤ-226010
فون نمبر:0522-4022924

شوکت علی، ایڈیٹر، پرنٹر اور پبلشر نے امپریشن پرنٹ ہاؤس، لاٹوش روڈ لکھنؤ سے چھپوا کر دفتر اردو اکادمی، واقع وبھوتی کھنڈ، گومتی نگر لکھنؤ سے شائع کیا۔

ترتیب

اداریہ	ایڈیٹر	۲
گاندھی جی ایک معلم ایک ادیب	ڈاکٹر منور حسن کمال	۳
گاندھی مہاتما تھے (نظم)	ساجد جلال پوری	۸
سرسید کا پیغام نوجوانوں کے نام	محمودہ قریشی	۹
غزل	عرفان لکھنوی	۱۳
غزل	نصیر احمد نصیر	۱۳
اردو انشائیہ اور اہم انشائیہ نگار	ڈاکٹر سیما صدیقی	۱۴
ساحر لدھیانوی (نظم)	شبانہ عشرت	۱۹
رشید قریشی: صحافت اور شاعری	ڈاکٹر مخمور کاکوروی	۲۰
غزل	سفیر مانچوی	۲۴
غزل	محبوب خیر آبادی	۲۴
رمن لال اگروال: میں فضاؤں...	محمد اویس سنبھلی	۲۵
ہم جس دن موجود نہ ہوں گے	عطیہ پروین	۳۰

●●●

اداریہ

۲/ اکتوبر کو بابائے قوم مہاتما گاندھی کا یوم پیدائش بڑی عقیدت اور احترام سے منایا جاتا ہے۔ مہاتما گاندھی کا یوم پیدائش سارے ہندوستانیوں کے لیے یہ پیغام لاتا ہے کہ عدم تشدد اور سچائی کا راستہ ہی وہ راستہ ہے جس پر چلنے میں پورے ملک بلکہ ساری دنیائے انسانیت کی نجات ہے اور یہ کہ تشدد، دہشت گردی، انتہا پسندی نہ کبھی مسئلے کا حل تھے اور نہ ہو سکتے ہیں۔ مہاتما گاندھی کے اس پیغام کی اشاعت ملک کو ترقی کے راستے پر لے جائے گی۔ مہاتما گاندھی نے فرقہ وارانہ ہم آہنگی اور ہندو مسلم اتحاد پر ہمیشہ زور دیا۔ وہ ساری زندگی قومی اتحاد کے لیے جدوجہد کرتے رہے۔ اپنی تحریروں، تقریروں، اپنے عمل اور برتاؤ کے ذریعہ فرقہ وارانہ ہم آہنگی قائم رکھنے کا جو راستہ انھوں نے دکھایا، وہ نہ صرف ہماری فلاح و ترقی بلکہ کسی بھی ملک کی بقا اور استحکام کے لیے ضروری ہے۔ ان الفاظ کے ساتھ اکادمی بابائے قوم مہاتما گاندھی جی کو خراج عقیدت پیش کرتی ہے۔

۲/ اکتوبر کو ہی ہندوستان کے افق پر دوسرا ستارہ نمودار ہوا جسے ہم لال بہادر شاستری کے نام سے جانتے ہیں۔ شاستری جی سادگی، خلوص اور اخلاقیات کے پیکر تھے۔ اپنی سادہ طرزِ زندگی اور اعلیٰ اقدار کی وجہ سے انھوں نے تحریک آزادی کو جلا بخشی۔ ساتھ ہی ہندوستان کے وزیر اعظم کی حیثیت سے انھوں نے ملک و قوم کی ترقی میں فعال کردار ادا کیا۔ شاستری جی نے جے جوان جے کسان کا نعرہ دے کر ملک کو استحکام بخشا۔ اکادمی لال بہادر شاستری کو بھی گلہائے عقیدت پیش کرتی ہے۔

اس مہینے میں ۱۷/ اکتوبر کو سرسید ڈے منایا جاتا ہے۔ سرسید احمد خاں کی شخصیت بلاشبہ ان عہد ساز شخصیات میں سے ایک تھی جن کی خدمات کو کبھی فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ وہ ایک مفکر، مصلح، عالم، دانشور اور ماہر تعلیم تھے۔ انھوں نے علی گڑھ تحریک کو کامیاب بنانے کے لیے بڑی صعوبتیں برداشت کیں لیکن ہمت نہیں ہارے۔ اپنے عزم و حوصلے اور اپنے رفقا کی وفاداریوں کی وجہ سے اپنے مقصد میں کامیاب بھی ہوئے۔ انھوں نے جس بیباکی اور جذبے سے ملک و قوم کی خدمات انجام دیں وہ اپنی مثال آپ ہے۔ عصر حاضر میں سرسید احمد خاں کے مقصد اور ان کے تعلیمی نظریے پر عمل پیرا ہونے کی اشد ضرورت ہے کیونکہ اس کے بغیر ہماری قوم نہ ترقی کر سکتی ہے اور نہ ہی زمانے کے ساتھ قدم سے قدم ملا کر چل سکتی ہے۔ اس لیے ضروری ہے کہ ہم سرسید احمد خاں کے مشن کو بروئے کار لاتے ہوئے اس کو عملی جامہ پہنانے کی بھرپور کوشش کریں تاکہ قوم کے تعلیمی معیار میں روز بروز بلندی حاصل ہو سکے۔

شوکت علی

ایڈیٹر

ڈاکٹر منور حسن کمال

ابوالفضل انکلیو، جامعہ نگر، نئی دہلی-Mob.9818649521

گاندھی جی: ایک معلم، ایک ادیب، ایک صحافی

گاندھی جی نے کہا تھا: ''تعلیم سے مراد ہے بچوں اور بڑوں میں ان کے ذہن، جسم اور روح کے اندر، جو بہترین صلاحیتیں ہیں، انھیں اُبھارا جائے، لکھنے پڑھنے کی قابلیت تعلیم کا منتہیٰ نہیں، بلکہ سچ پوچھئے تو یہ تعلیم کی ابتدا نہیں۔ یہ محض ایک ذریعہ ہے ان ذرائع میں سے جن سے مردوں اور عورتوں کو تعلیم دی جاتی ہے، اس لیے میں بچے کی تعلیم اس طرح شروع کرنا چاہتا ہوں کہ اُسے کوئی مفید دستکاری سکھاؤں اور اس قابل بنادوں کہ وہ پہلے ہی دن سے کوئی کام کی چیز پیدا کرنے لگے۔

گاندھی جی نے بڑے نپے تلے انداز میں تعلیم سے متعلق اپنا موقف واضح کیا کہ قلم و کاغذ سے رشتہ جوڑنے کو محض تعلیم حاصل کرنا نہیں مانتے، بلکہ وہ چاہتے ہیں کہ تعلیم کے ذریعہ ذہنی، جسمانی اور روحانی طور پر جو بھی صلاحیتیں ہیں، انھیں اُبھارا جائے اور ان کو یہ سکھایا جائے کہ ان کے لیے تعلیم کا حصول محض یہ نہیں ہے کہ وہ لکھنا پڑھنا سیکھ گئے اور بس، تعلیم کے تئیں ان کا مقصد پورا ہوگیا، نہیں — بالکل نہیں۔ بلکہ اصلی تعلیم وہ ہے جو ان کی روح کے اندر تک سرایت کر جائے اور اس سے وہ اپنی روحانی تازگی حاصل کریں جو انھیں کیف کی اس وادی میں لے جائے جو انھیں ان کی منزل مقصود تک پہنچادے۔ گاندھی جی کا خیال تھا اس طرز تعلیم سے ذہن اور روح کی زیادہ سے زیادہ نشو ونما ہوسکتی ہے۔

یہ بات پوری طرح ذہن نشین رہنی چاہیے کہ تعلیم دنیا کی انمول چیزوں میں سے ایک ایسی چیز ہے، جس سے ہم تربیت بھی حاصل کرسکتے ہیں اور اس کے حصول سے اپنے ذہن و دل دونوں کو روشن بھی کرسکتے ہیں۔ دنیا کے جو چند بڑے افراد رہے ہیں، جن کو آج بھی انگلیوں پر گنا جاسکتا ہے، انھوں نے ہر شخص کے لیے تعلیم کو ضروری قرار دیا ہے۔

آج صورتحال یہ ہے کہ جیسے جیسے تعلیم کے مدارج بڑھ رہے ہیں اور تعلیم فزوں سے فزوں تر ہوتی جارہی ہے، ویسے ویسے ہی اس کی اہمیت کو لوگ نظر انداز بھی کررہے ہیں۔

آج تعلیم ایک بڑی اور مرکزی معیشت کے طور پر اُبھر کر سامنے آئی ہے، لیکن معیشت کی جانب جن لوگوں کا رجحان ہے، انھوں نے تعلیم کو ایک بزنس بنا لیا ہے، ایسا بزنس اور ایسی تجارت جس سے وہ فی الفور فائدہ اُٹھاسکیں۔

گاندھی جی کا خیال تھا تعلیم میں تہذیب نفس اور تعمیر سیرت کو سب سے مقدم سمجھنا چاہیے۔ اسی لیے وہ اپنے افریقہ

کے سفر میں دن رات بہت سے بچوں کے ساتھ رہے اور پدرانہ شفقت سے ان کی تربیت کی نگرانی کی اور تعمیر سیرت کو اور تعلیم کی بنیاد کے نقطۂ نظر کو پروان چڑھایا۔ وہ ٹالسٹائے فورم کی اس حیثیت کے قائل تھے جس میں خاندان کا ایک فرد ''بمنزلہ باپ'' رہے اور سب کی تعلیم وتربیت کی ذمہ داری کو اُٹھائے۔

ایسا نہیں ہے کہ وہ کتابی تعلیم کے یکسر خلاف تھے، لیکن وہ جسمانی تربیت کو بھی کتابی تعلیم کے ساتھ ساتھ ضروری سمجھتے تھے۔ گاندھی جی اس بات کے قائل تھے کہ کتابوں کو پڑھ کر یادرکھنا ایک حدتک مشکل ہوتا ہے، لیکن جو کچھ طلبا کو زبانی بتایا اور سمجھایا جائے وہ آسانی سے ذہن نشین ہوجاتا ہے۔ اور جو چیزیں طلبا کے ذہن نشین ہوجائیں، وہ انھیں نہیں بھولتے، بلکہ جب پوچھو فرفر سنادیتے ہیں۔

گاندھی جی کہا کرتے تھے کہ مجھے اپنی کوتاہیوں کا اعتراف ہے۔ میں نے ایسی تعلیم جسے یونیورسٹی کی تعلیم کہہ سکیں، نہیں پائی ہے۔ اسکول میں بھی میری قابلیت کبھی اوسط درجے سے زیادہ کی نہیں رہی۔

آپ دیکھ سکتے ہیں جس شخص کے ایسے خیالات ہوں، وہ اسکولی تعلیم کے ساتھ ساتھ تربیت کو کیوں نہ ضروری قرار دے گا۔ گاندھی جی کا اپنی مجلسوں میں ایسا انداز ہوتا تھا کہ ہر شخص یہ سمجھتا تھا کہ یہ کوئی بہت بڑے وِدّوان ہیں...... اور اس میں کوئی شک نہیں ان کی شخصیت ایسی ہی سحرانگیز تھی، ہر کوئی یہ سمجھتا تھا کہ انھوں نے تمام بڑے علوم حاصل کیے ہیں، لیکن یہ سب انھوں نے اپنے مطالعے سے حاصل کیا تھا، یا ان لوگوں سے سیکھا تھا، جن کے ساتھ زندگی کے اوائل میں اور اس کے بعد کی زندگی میں ان کے ساتھ رہے۔ وہ اس بات کو بانگ دہل کہتے تھے کہ مجھے ہمیشہ یہ تمنا رہتی ہے کہ اپنی غلطیاں معلوم کروں اور ان کو درست کروں۔

اب ایک نظر ان نظریات پر ڈالتے ہیں جن کے وہ قائل تھے اور جب موقع ملتا ان پر عمل کرتے تھے۔

الف: میں اعلیٰ سے اعلیٰ تعلیم کا جو دنیا میں کہیں بھی حاصل ہوسکتی ہے، مخالف نہیں ہوں۔

ب: اس تعلیم کا خرچ ریاست کو اسی وقت ادا کرنا چاہیے جب وہ اس کے کسی خاص مقصد کو پورا کرتی ہو۔

ج: مجھے اس سے اختلاف ہے کہ ساری اعلیٰ تعلیم کا خرچ ریاست کی آمدنی سے ادا کیا جائے۔

انھوں نے نہایت ایمانداری سے یہ رقم کردیا ہے کہ تعلیم کے لیے محض ریاستوں پر انحصار نہیں کرنا چاہیے، بلکہ خود بھی اپنے اخراجات برداشت کرنے کی صلاحیت پیدا کرنی چاہیے، لیکن آج ہم اپنی تمام تعلیم اور اپنے تمام تعلیمی نظام کے لیے مرکز اور ریاستی سرکاروں کو موردالزام ٹھہراتے ہیں، اس پر غور کرنے کی ضرورت ہے۔

گاندھی جی بہ حیثیت ایک ادیب صحافت کی طاقت کو اچھی طرح سمجھتے تھے۔ وہ جانتے تھے کہ اخبار ایک ایسا ذریعہ ہے، جس کے ذریعے ہر ضروری بات عام آدمی تک پہنچائی جاسکتی ہے۔ بھلے ہی آج الیکٹرانک میڈیا کا بول بالا ہو، لیکن اخبارات کی جو قدر واہمیت اس دور میں تھی، آج بھی بلاشبہ کسی طور کم نہیں

ہے۔بس اپنی بات لوگوں تک پہنچانے کا فن آنا چاہیے۔

گاندھی جی کو دوسری زبانوں کے ساتھ ساتھ اردو سے بھی بڑی محبت تھی۔ان کے ہاتھ کے لکھے ہوئے خطوط بہت سی لائبریریوں اور آرکیالوجی میں محفوظ ہیں، گاندھی جی نے جہاں گجراتی، انگریزی اور ہندی میں اخبارات نکالے، وہیں اردو میں بھی اخبار نکالا، اس اخبار کا نام 'ہریجن سیوک' تھا۔ یہ اخبار ہفتہ روزہ تھا۔نوجیون پریس کے ٹرسٹی اور سربراہ کپل راول کے مطابق گاندھی جی جنوبی افریقہ سے جب لوٹے تو انھوں نے مشاہدہ کیا کہ برصغیر ہند کے باشندوں کو اخبارات و دیگر ذرائع کے تعلق سے معلومات نہیں ہے۔اس وقت گاندھی جی نے لوگوں کو انگریزوں کے چنگل سے نکالنے اور ان میں بیداری پیدا کرنے کے لیے اخبار نکالنا شروع کیا۔

گاندھی جی ایک ادیب کے طور پر اخبار اور صحافت کی بڑی قدر کرتے تھے۔اسی لیے اس دور کے سرکردہ صحافیوں میں مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا محمد علی جوہر اور مولانا ظفر علی خاں سے ان کے بڑے اچھے مراسم تھے۔ برصغیر کی آزادی کی لڑائی انھوں نے ان سب کے ساتھ مل کر لڑی۔

ان کی اہم خدمات میں ان کی کتاب 'اروگیہ دگ درش' کا بھی بہت اہم رول رہا ہے۔ یہ ایک ٹیکسٹ بک تھی۔جس کو صوبہ جات متحدہ کی ٹکسٹ بک کمیٹی نے سرکاری وغیرسرکاری اسکولوں اور مدارس کے مطالعہ کے لیے اپنے اجلاس منعقدہ یکم دسمبر 1926 کو ایک خاص ریزولیشن میں منظور کیا تھا۔ یہ کتاب نرائن دت اینڈ سنز لاہور نے شائع کی تھی۔ یہ کتاب دراصل پہلے گجراتی زبان میں لکھی گئی تھی۔ پھر اس کا اردو زبان میں ترجمہ کیا گیا تھا۔اس کتاب میں اسکولی بچوں سے متعلق معلوماتی مضامین ہیں جن کے عناوین تندرستی، ہمارا جسم، ہوا، پانی، خوراک، ورزش، پوشاک، مرد عورت کا تعلق، پانی کا علاج، مٹی کے ذریعہ علاج، بخار اور اس کا علاج، قبض، سنگرہنی، اسہال، بواسیر، چھوت کی دیگر بیماریاں، بچوں کی پیدائش، ڈوبنا، جلنا، سانپ کا کاٹنا اور بچھو وغیرہ کے ڈنک قابل ذکر ہیں۔

گاندھی جی نے اس کتاب کے دیباچے میں لکھا ہے:

> ''تقریباً بیس سال سے میں مضمون صحت پر غور کرتا رہا ہوں۔ چند ذاتی اصولوں کی پابندی کی وجہ سے ولایت میں رہتے وقت کھانے پینے کا سب انتظام اپنے ہاتھ ہی سے کرنا پڑتا تھا۔ اس وقت مجھے جو تجربے ہوئے ان سے میں نے کئی نتائج اخذ کیے، جن کا علم ناظرین [قارئین] کی دلچسپی اور فائدے کی خاطر کچھ ذکر کرنا چاہتا ہوں۔انگریزی میں مثل مشہور ہے'علاج سے پرہیز بہتر ہے' یعنی بیماری کو رفع دفع کرنے کی نسبت اسے پیدا ہی نہ ہونے دینا بہتر ہے۔ ہماری کہاوت 'پانی سے پہلے پُل باندھا جائے' بھی یہی ظاہر کرتی ہے۔ مرض نہ ہونے دینے کی ترکیبوں سے استعمال کو انگریزی میں 'ہائی جین' کہتے ہیں۔ ہماری زبان میں اسے 'حفظ صحت و ماتقدم' کہتے ہیں۔

گاندھی جی نے درج بالا عناوین سے بچوں کے ساتھ ساتھ بڑوں کو بھی اپنی صحت کے تئیں بیدار کرنے کی سعی بلیغ کی ہے۔سمترا گاندھی کلکرنی بنت رام داس جو گاندھی جی کی پوتی ہیں، وہ آئی اے ایس افسر ہونے کے ساتھ ساتھ راجیہ سبھا میں گجرات کی نمائندگی کرتی تھیں، ایک جگہ ان کے

حوالے سے لکھا ہے:

گاندھی جی یکسوئی کا فن جانتے تھے۔ ان میں استقلال تھا، وہ شور شرابے سے بھری بھیڑ میں بھی سو سکتے تھے۔ سب سے اہم یہ کہ حالات چاہے جیسے ہوں، غلط کام کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اپنے آپ کو ایک بار صحیح راستے پر چلنے کے لیے تیار کرو تو پھر دباؤ ڈالنے والی قوتیں کمزور ہونے لگتی ہیں۔ معاشرے کے ان لوگوں کی مدد کریں جو ضرورت مند ہیں..... بس اتنا سوچیں کہ میں نے اپنا فرض ادا کیا ہے۔ اب یہ اس پر ہے کہ وہ اپنا فرض نبھائے یا نہ نبھائے۔''

گاندھی جی کا مضمون GreatSentinel (عظیم سنتری) ان کی شہرت کا سبب بنا۔ یہ مضمون انھوں نے رابندرناتھ ٹیگور کے ایک مضمون کے جواب میں لکھا تھا۔ آزادی سے قبل جو ملک کے حالات تھے وہ کسی سے پوشیدہ نہیں تھے۔ اس دوران گاندھی جی نے اپنی دلی خواہش کا اظہار اس طرح کیا تھا:

''میں دل سے چاہتا ہوں کہ یہ گیت کار اور اس عہد کے سبھی دوسرے لوگ چرخا چلائیں۔ جب لڑائی چھڑ جاتی ہے گیت کار بانسری کو ایک طرف رکھ دیتا ہے۔ وکیل اپنی رپورٹ کو ایک طرف کر دیتا ہے اور طالب علم اپنی کتابوں سے کنارہ کشی اختیار کر لیتا ہے۔ شاعر اپنے جذبات کی ترجمانی اس وقت کرتا ہے جب جنگ کو فتح کر لیا جاتا ہے..... جب میرے چاروں طرف لوگ خوراک کی کمی کے باعث دم توڑ رہے ہیں، محض ایک ہی بات جس کی اجازت مجھے میرا ضمیر دیتا ہے، وہ ہے بھوکوں کا پیٹ بھرنا..... ہمارا ہندوستان محض شہروں میں ہی نہیں رہتا، ہندوستان ہمارے ساڑھے سات لاکھ گاؤں میں بستا ہے۔

بہ حیثیت ایک ادیب وصحافی گاندھی جی نے پورے برصغیر کا جائزہ لیا تھا اور وہ ملک کے غریب کسانوں، محنت کشوں اور مزدوروں کا درد سمجھتے تھے، اسی لیے ان کا خیال تھا کہ شاعر اپنی شاعری چھوڑ دیں اور جو بڑے عہدوں پر فائز افراد ہیں، وہ اپنی کرسیاں چھوڑ دیں اور برصغیر ہند کے محروم طبقات کی مدد کے لیے آگے آئیں۔

گاندھی جی نے اچھوتوں کا نام بدل کر انھیں ہریجن بلانا شروع کیا تھا۔ یہاں یہ بات بھی سمجھ لینی چاہیے کہ ہریجن کے معنی بھگوان کی اولاد کے ہیں۔ ہندوستان کی آزادی کے ساتھ ساتھ انھوں نے اچھوتوں کی آزادی کو بھی ایک ضروری عنصر قرار دیا تھا۔ انھوں نے اپنی اس تحریک کی وضاحت اس طرح کی تھی: ہریجن کا مطلب ہے ایشور کی اولاد، دنیا کے تمام مذاہب میں برابری کا سبق دیا گیا ہے۔ اسی لیے انھوں نے اچھوتوں کو ان کا حق دلانے کے لیے آواز بلند کی۔ جب احمد آباد شہر کے باہر انھوں نے اپنا پہلا آشرم قائم کیا تو اس کا نام 'ہریجن بھون' رکھا۔

پروفیسر محمد مجیب نے لکھا ہے:

''گاندھی جی کی آرزو تھی کہ ہندوستان کی ایک زبان ہو، 'ہندی یعنی ہندوستانی' جسے دیوناگری اور اردو لپیوں (رسم خط) میں لکھا جائے۔ ہم نے زبان کو ایک سیاسی مسئلہ بن جانے دیا۔ ہندوستانی بولتے رہے، اسے پسند کرتے رہے مگر اسے سیکھنا، سکھانا بند کر دیا۔ ادھر ہندی کو جنتا کی زبان کہتے رہے اور اسے اتنا مشکل بنا دیا کہ وہ جنتا کی ہو ہی نہیں سکتی۔''

بعض نامساعد حالات کے سبب جب 'ہری جن سیوک' بند کرنے کی نوبت آئی تو گاندھی جی نے ہندی ایڈیشن کے ساتھ اردو ایڈیشن بھی بند کردیا۔ جب اس سلسلے میں ان سے دریافت کیا گیا تو انھوں نے کہا:

''مجھے اس بات کی وضاحت کرنے دیجیے کہ میں نے کیوں دونوں ایڈیشنوں کو بند کردیا۔ یہ صحیح ہے کہ جب ناگری 'نوجیون' اور دیوناگری 'ہری جن سیوک' شائع ہونا شروع ہوئے تو دونوں رسم خطوں کا کوئی تنازع نہیں تھا اور اگر رہا بھی تو کم از کم میرے علم میں نہیں۔''

دریں اثنا مرحوم سیٹھ جمنا لال ...... کی ایما پر 'ہندوستانی پرچار سبھا' کا قیام عمل میں آیا۔ اس بار اردو ایڈیشن نکالنا بے حد ضروری ہوگیا۔ اب اگر میں اردو ایڈیشن بند کردیتا اور صرف دیوناگری ایڈیشن جاری رکھتا تو یہ خود میری نظروں میں انتہائی غیر معمولی امر ہوتا۔''

(ہماری زبان انجمن ترقی اردو (ہند) 15/جون 1978ء، گوپال متل بہ شکریہ رسالہ تحریک نئی دہلی)

اس اقتباس سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ وہ دونوں زبانوں سے یکساں محبت رکھتے تھے۔

ہندوستان کے مستقبل کا جو خاکہ ان کے ذہن میں تھا، وہ اس خاکہ کو لفظوں کا جامہ پہنا کر لوگوں کی رگوں میں حرارت پیدا کرنا چاہتے تھے..... اور اس میں وہ بڑی حد تک کامیاب بھی ہوئے— گاندھی جی کی زندگی کا سب سے اہم مقصد محروم طبقات کو اوپر اٹھانا تھا۔ جس کے لیے وہ تاعمر کوششیں کرتے رہے۔ ان کے یہاں قوموں کی کوئی تفریق نہ تھی۔ غریب چاہے برہمن ہو یا مسلمان، دلت ہو یا اور کسی پسماندہ برادری سے تعلق رکھتا ہو، وہ بھوکا نہ رہے۔ وہ صرف اسی چیز کو ضروری سمجھتے تھے جو عوام کے لیے مفید اور کارآمد ہو۔ ایک جگہ لکھتے ہیں:

''غریب سے غریب لوگ بھی محسوس کریں کہ یہ ان کا اپنا ہندوستان ہے، جس کی تعمیر میں ان کی پر اثر آواز شامل ہو، ایک ایسا ہندوستان جس میں کوئی چھوٹا بڑا نہیں ہو، جس میں تمام طبقوں کے لوگ آپس میں مل جل کر رہیں۔ ایسے ہندوستان میں چھوت چھات کے لیے کوئی جگہ نہ ہو..... اور نہ نشہ آور دواؤں کے لیے اس میں کوئی جگہ ہو..... اور عورتوں کو وہی حقوق حاصل ہوں، جو مردوں کو ہیں۔''

گاندھی جی کی ایک اہم تصنیف 'میری ستیہ سادھنا' ہے۔ اس کتاب میں انھوں نے اپنی پیدائش سے لے کر جوانی، سفر افریقہ، وہاں سے واپسی پر وکالت کا آغاز، ملک کی آزادی کے لیے جدوجہد سمیت اپنی ذاتی زندگی کی جھلکیاں پیش کی ہیں۔ بچوں کو تعلیم دینے کا طریقہ، اپنا برہم چریہ وغیرہ پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے..... چھوت چھات کو جڑ سے اکھاڑ پھینکنے، ہندو- مسلم اتحاد کے لیے کی گئی اپنی کوششیں اور برطانوی حکومت کے مظالم کا ڈٹ کر مقابلہ کرنے پر گفتگو کی ہے اور آخر میں اپنے عظیم خیالات کا بایں الفاظ اظہار کیا ہے:

..... لیکن بغیر روحانی پوترتا کے کوئی بھی ہر جاندار کو سینے سے نہیں لگا سکتا۔ بغیر روحانی عظمت کے اہنسا کا اصول ایک بنیادی سپنا ہی رہے گا۔ مالک دوجہاں کے دیدار کسی ایسے شخص کو نہیں ہوسکتے، جس کی

روح پاک نہ ہو..... اپنے نفس پر قابو پا کر ہی انسان اہنسا کے راستے پر چل سکتا ہے۔

گاندھی جی کو لکھنے کا شوق جنون کی حد تک تھا۔ گاندھی جی کی ابتدائی تصانیف میں سے ایک 'ہند سوراج' بھی بہت اہم کتاب ہے۔ یہ کتاب 1959 میں گجراتی زبان میں شائع ہوئی۔ لیکن دیگر زبانوں میں اس کے تراجم ہوئے۔ یہ بات بڑے وثوق اور یقین سے کہی جاسکتی ہے کہ وہ قلم کے ایک ایسے سپاہی تھے جو ہر روز کچھ نہ کچھ لکھتے رہتے تھے۔ مضامین لکھنا، مختلف اخبارات کے مدیروں کو خطوط لکھنا ان کی یومیہ سرگرمیوں کا حصہ تھا۔ ان کی تمام کتابیں حکومت نے 1960 کی دہائی میں چھپوائی تھیں۔ ان کے کل صفحات پچاس ہزار ہیں اور انھیں 100 جلدوں میں جمع کیا گیا ہے۔

مستفاد

۱۔ تلاشِ حق '' گاندھی جی آپ بیتی (جلد دوم) مترجم: ڈاکٹر سید عابد حسین، مطبوعہ مکتبہ جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی سنہ اشاعت ۱۹۵۳ء

۲۔ سب انسانی بھائی بھائی ہیں '' گاندھی جی زندگی اور خیالات، مطبوعہ ساہتیہ اکادمی، نئی دہلی سنہ اشاعت ۱۹۶۶ء

۳۔ گاندھی جی کی غیر معمولی قیادت، مصنف پاسکل ایلن نظارت، مترجم رفعت صدیقی، مطبوعہ اردو اکادمی، دہلی سنہ اشاعت ۲۰۱۳ء

□□□

ساجدؔ جلال پوری
جلالپور، امبیڈکرنگر- Mob.7571867185

گاندھی مہاتما تھے

وہ ایکتا کا سنگم ، گاندھی مہاتما تھے
زخمی دلوں کا مرہم گاندھی مہاتما تھے
جھوٹوں سے کیوں ہو یاری، وہ ستیہ کے پجاری
شعلوں کو کردیں شبنم ، گاندھی مہاتما تھے
تحریک ہو نمک کی یا ہو عدم تشدد
ان کا بلند پرچم گاندھی مہاتما تھے
ہر قوم اک صدا پر حاضر ہے ، جیسے لب پر
رکھتے ہو ں اسم اعظم ،گاندھی مہاتما تھے
گنگا کے پانیوں سے ان کی عقیدتیں تھیں
تھا پیارا آبِ زم زم ، گاندھی مہاتما تھے
حیران تھے فرنگی ، جرأت کو دیکھ ان کی
رکھتے تھے عزم محکم ، گاندھی مہاتما تھے
بھارت کے واسیوں کی جب دیکھتے تھے حالت
ہوتی تھی آنکھ پرنم ، گاندھی مہاتما تھے
درجہ برابری کا سب اہل ہند پائیں
کوشش تھی ان کی پیہم ، گاندھی مہاتما تھے
فتنہ فساد کم ہو خواہش تھی مرتے دم تک
مل جائے قوم باہم ، گاندھی مہاتما تھے
سادھو ، فقیر ، ایسا ساجد کہاں ہے جس کو
ڈھونڈھے نگاہ ہر دم ، گاندھی مہاتما تھے

●●●

محمودہ قریشی
(ریسرچ سکالر، دہلی یونورسٹی دہلی۔)
Mob.7417912943

سرسید کا پیغام قوم کے نوجوانوں کے نام

سرزمین ہندوستان مہاپرشوں، مذہبی پیشواؤں، صوفیاءاکرام اور مصلحین سے خالی نہیں جنھوں نے معاشرے میں اخلاقی قدروں اور محبت کی جڑوں کو مضبوط کرنے کے ساتھ انسانی ہمدردی کو ہی اپنا فرض قرار دیا ہے۔ایسے ہی مصلحین کے سلسلے کی ایک کڑی سرسید احمد خاں تھے جنھوں نے اپنی پوری زندگی تمام ہندوستانیوں کی بھلائی و ترقی کے لئے وقف کردی۔سرسید احمد خاں وہ پہلے شخص ہیں جنھوں نے ہندوستانیوں خصوصاً مسلمانوں کو جدید علوم وسائنس کی تعلیم کی طرف متوجہ کیا۔وہ جدید ہندوستان کے معمار اور علی گڑھ تحریک کے بانی مسلمانوں کے نشاۃ ثانیہ تصور کیے جاتے ہیں۔اپنی 81 سالہ زندگی میں انھوں نے جو کارہائے نمایاں انجام دیئے وہ ہماری تاریخ کا ایک زریں باب ہیں۔جیسا کہ حکیم احمدالدین لکھتے ہیں:

”جوادالدولہ, عارف جنگ آنریبل, ڈاکٹر سرسید احمد خاں صاحب بہادر, کے۔سی۔ایس۔آئی, ایل ایل ڈی, لائف سکریٹری مدرستہ العلوم مسلمانان علی گڑھ و رئیس دہلی, ایک خاص اعلیٰ دماغ کے تھے ان کی ذات میں ہزاروں خوبیاں خدانے کوٹ کوٹ کر بھری تھیں۔“

سرسید 1857 کے سانحہ کے بعد مسلمانوں کی حالت دیکھ کر تڑپ اٹھے تھے اور اپنی ساری صلاحیتوں کو بروئے کار لا کر قوم کی فلاح و بہبود پر اپنی توجہ کو مرکوز کر دینا چاہتے تھے۔اس کے لئے انھوں نے کئی اقدام اٹھائے جس میں تعلیم کو اولیت کا درجہ حاصل ہے۔وہ ہر دم خصوصاً مسلمانوں کی سماجی اور تعلیمی سدھار اور ترقی کے لئے کوشاں نظر آتے تھے۔سرسید مسلمانوں کی سماجی اور تعلیمی پسماندگی کی وجہ سے اپنی توجہ زیادہ تر ان ہی پر مزکور رکھتے ہیں۔چونکہ اس وقت مسلمان سب سے نیچی سطح پر پہنچ گئے تھے۔مسلمانوں کے مطابق انگریزی تعلیم ان کو عیسائی بنادے گی۔لیکن سرسید نے اپنی دوررس نگاہوں سے یہ بھانپ لیا تھا کہ اگر مسلمان انگریزی تعلیم حاصل نہیں کریں گے تو ان کی حالت میں سدھار نہیں کیا جا سکتا۔چونکہ انھوں نے انگریزی حکمرانوں کی پھوٹ ڈالو اور حکومت کرو کی پالیسی کی آہٹ بھی محسوس کر لی تھی، اسی مقصد کے تحت وہ مسلمانوں کی تہذیبی، تعلیمی، تمدنی و مذہبی اصلاح کرنا چاہتے تھے۔جس کے پیش نظر بہت سی تجاویز پیش کیں، منصوبے بنائے اور عملی اقدام اٹھائے۔

اسی پسماندگی کو دور کرنے کے لئے انھوں نے سفر

انگلستان گیا تاکہ وہ وہاں کی تعلیمی اور سماجی ترقی دیکھ کر سیکھیں اور لوگوں کو انگلستان کی صنعتی ترقی بتائیں انگلش قوم کی ترقی دیکھ کر وہ متاثر ہوئے اور چاہتے تھے کہ اہل ہندوستان بھی اس کی پیروی کریں۔انھوں نے آکسفورڈ اور کیمبرج یونیورسٹی جا کر وہاں کے نظام تعلیم کو دیکھا تاکہ وہ ہندوستان پہنچ کر اپنے ملک کی ضرورت کے لحاظ سے یہاں بھی ویسا ہی نظام تعلیم رائج کریں۔اور وہ جب بھی مسلمانوں میں سماجی اصلاح کی بات کرتے تھے، ساتھ ہی ساتھ مسلمانوں میں مغربی علوم کے فروغ کی بات کرتے تھے۔انھوں نے علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ، اور تہذیب الاخلاق کے ذریعے مسلمانوں میں سوشل ریفارم اور اس کی اہمیت کا پیغام بھی دیا ہے۔وہ آنے والے وقت کے سماجی مسائل سے بخوبی واقف تھے چونکہ آج کے دور میں سائنس اور ٹکنالوجی کے بغیر کچھ نہیں ہوسکتا۔شاید اسی لئے وہ اپنے دوستوں سے قرض لے کر، اپنی جائداد کو گروی رکھ کر یہاں تک کہ اپنا ذاتی کتب خانہ بھی فروخت کر کے انگلینڈ کے لئے روانہ ہوئے اور انگلینڈ میں تمام چیزوں کا مطالعہ کرنے کے بعد اپنے ذہن میں مسلم معاشرے کے لئے ایک خاکہ تیار کر کے ہندوستان واپس آئے۔ 1875 میں انھوں نے ایک چھوٹا سا مدرسہ قائم کیا یہی مدرسہ 1877 میں محمڈن اینگلو اورینٹل کالج میں تبدیل ہوا اور ترقی کے منازل طے کر کے 1920 میں علی گڑھ مسلم یونورسٹی ہو گیا۔یعنی سرسید نے علم کی جو شمع مدرستہ العلوم کے روپ میں روشن کی تھی وہ آج علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی شکل میں دنیا بھر میں روشنی پھیلا رہی ہے۔دور حاضر کے تناظر میں سرسید کے مشن کے بنیادی عناصر پر گہرائی کے ساتھ غور وفکر کی ضرورت ہے وقت کا تقاضہ ہے کہ سرسید کے مشن کو تقویت دی جائے کیوں کہ ہندوستان کو عظیم ممالک کی صف میں شامل کرانے کا یہی واحد ذریعہ تھا اور ہے۔

آج ہم سرسید کے مشن کو کتنا کامیاب رکھے ہوئے اور اس پر کتنی سنجیدگی سے گامزن ہیں۔بقول علی احمد فاطمی:

”سرسید جب زندہ تھے تب بھی ہم تھے۔اور آج جب سرسید ہمارے درمیان نہیں ہیں تب بھی ہم ہیں۔“

اس کا احساس خود سرسید کو تھا جس کا ذکر اپنے ایک خط میں مسلمانان ہند کی حالت پر افسوس کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

”افسوس کہ مسلمان ہندوستان کے ڈوبے جاتے ہیں اور کوئی ان کا نکالنے والا نہیں ہائے افسوس! امرت تھوکتے ہیں اور زہر اگلتے ہیں۔ہائے افسوس! ہاتھ پکڑنے والے کا ہاتھ جھٹک دیتے ہیں اور مگر کے منھ میں ہاتھ دیتے ہیں۔اے بھائی مہدی! فکر کرو اور یقین جان لو کہ مسلمانوں کے ہونٹوں تک پانی آ گیا ہے، اب ڈوبنے میں بہت ہی کم فاصلہ باقی ہے۔اگر تم یہاں آتے تو دیکھتے کہ تربیت کس طرح ہوتی ہے۔اور تعلیم اولاد کا کیا قاعدہ ہے علم کیوں کر آتا ہے اور کس طرح کوئی قوم عزت حاصل کرتی ہے ان شاءاللہ تعالیٰ میں یہاں سے واپس آ کر سب کچھ کہوں گا اور کروں گا مگر مجھ کافر مردود، گردن مروڑی مرغی کھانے والے، کفر کی کتابیں چھاپنے والے کی کون سنے گا۔“

اس مختصر سی تحریر سے سرسید کے جنون کیفیت اور ان

پر مغربی نظام تعلیم, کے اثرات کا اندازہ بخوبی کیا جا سکتا ہے۔ ساتھ ہی اس وقت مسلم طبقے کی جو ذہنی کیفیت تھی ان کے غصہ سے صاف عیاں ہوتی ہے۔ سر سید اعلیٰ عہدے پر فائز تھے ایک پرسکون زندگی گزار رہے تھے اور وہ اپنی زندگی گزار کر چلے جاتے پھر کیوں انھوں نے مسلمانوں کے ایسے مذہبی پھوڑوں کو چھیڑا اور ساتھ ہی ساتھ اس میں نشتر جراحی کا کام بھی شروع کیا۔ علوم سائنس کی کڑوی دوائیاں بھی پلائیں؟ ان کا مقصد صرف ایک تھا قوم کو جہالت کے گڈھے سے نکال کر ان میں جدید علم کی شمع روشن کرنا۔ بقول حالی ''زندہ قومیں ہی ملک کا روشن مستقبل بناتی ہیں اسی لئے سر سید اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

''موجودہ کالجوں میں مذہبی تعلیم نہیں ہے اور ہم کو اپنے نوجوان بچوں کو دینی و دنیاوی دونوں تعلیمیں دینی ہیں- اور اس کے ساتھ تربیت۔ پس اس کا سامان قوم پر جمع کرنا واجب ہے۔''

(خطبات سر سید جلد 2 ص 277)

ہمارا آج کا نظام تعلیم کچھ بہتر نہیں آج ضرورت اس بات کی ہے کہ ہمیں اپنی یونیورسٹیوں، کالجوں، مدرسوں میں سر سید کی تعلیم کو عام کرنا ہے اور اپنا محاسبہ کرنا ہے کہ ہم کہاں تک اس میں کامیاب ہیں۔ جدید علوم کا جو بیج سر سید نے بویا تھا جس میں نئے نئے پھل آنے کے امکانات تھے, ایسے لذیذ میوے جن کو کاٹنے کے لئے ہمارے ہاتھ کیوں نہیں پہنچ پا رہے ہیں۔؟ حقیقت میں وہ بیج تو ڈالے گئے ہیں, اور اب وہ پھل دار درخت بھی ہو گئے ہیں۔ یعنی ہماری یونیورسٹیاں ہیں، کالجز ہیں اور مدرسے بھی پھر کیوں ان درختوں سے فائدہ نہ اٹھائیں، ان لذیذ میووں کے ذائقہ سے محروم رہیں؟ سوال نظام تعلیم سے ہے، نوجوانوں سے ہے اور ان پر عمل پیرا مسلمانوں سے ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ہمیں سر سید کے مشن کو قائم رکھنا ہے۔ آج سائنس اور ٹکنالوجی کے دور میں سائنسی مغربی علوم کے حصول پر زور دینا ہے اور سائنٹفک طریقہ پر عمل کر کے قوم کی فلاح و بہود کے مشن کا علم اٹھاتے ہوئے سر سید کے مشن کو کامیاب بنانا ہے۔ جس کا اظہار وہ اپنی ایک تقریر میں کرتے ہوئے کہتے ہیں:

''اے میرے عزیزو! میری یہ آرزو ہے کہ میں اپنی قوم کے بچوں کو آسمان کے تاروں سے اونچا اور سورج کی طرح چمکتا ہوا دیکھوں۔ ان کی روشنی اس نیلے نیلے گنبد کے اندر ایسی پھیلے کہ سورج, چاند اور ستارے سب اس کے آگے ماند ہو جائیں.....

میرے تمام بچے طالب علم جو کالجوں میں پڑھتے ہیں اور جن کے لیے میری آرزو ہے کہ وہ یورپ کے سائنس اور لٹریچر میں کامل ہوں اور تمام دنیا میں اعلیٰ شمار کیے جائیں ان دو الفاظ لا الہٰ الا اللہ محمد رسول اللہ کو نہ بھولیں۔''

یعنی سر سید صرف یہ نہیں چاہتے تھے کہ صرف مسلمان جدید علوم کی تعلیم حاصل کر کے مغربی تہذیب کے قصیدہ خواں بن جائیں بلکہ وہ ہمیشہ تعلیم کو تہذیب اور مذہب سے جوڑ کر راہ ہموار کرنے کے حق میں تھے۔ وہ مذہب اور علم دین سے پیوست رہنے کی تلقین کرتے ہیں۔ وہ ایک موقع پر علی گڑھ طلبہ سے خطاب کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

''اگر تم اپنے دین پر قائم نہ رہے اور سب کچھ ہو گئے اور آسمان کے تارے ہو کر چمکے تو کیا ہوا، تم ہم میں سے نہ رہے، میں چاہتا ہوں کہ تمہارے ایک ہاتھ میں قران ہو، دوسرے میں علوم جدید اور سر پر لا الہٰ الا اللہ کا تاج ہو۔''

دراصل سرسید نے مذہب اور سائنس میں موافقت پیدا کرنے کی کوشش کی وہ مذہب اور سائنس سے رشتہ اس طرح ہم آہنگ کرنا چاہتے ہیں جس کی آج کے سماج کو بے حد ضرورت ہے۔ آج ہمارے پاس سائنس تو ہے لیکن ہم مذہب کو بھول گئے ہیں۔ جدید تعلیم اور یورپ کے روشنی علم و ہنر میں مذہب کا دامن ہم سے چھوٹ گیا ہے۔ اس لئے نظام تعلیم کو بہتر بنانے کے لئے ہمیں حصول تعلیم کا مقصد مذہب سے جوڑ کر راہیں روشن کرنی ہیں۔ سرسید نے جس طرح ہم میں تعلیم کا ذوق پیدا کرنے کے لئے قائدانہ رول ادا کیا آج کے وقت میں ان نظریات کو پھیلانے کی از حد ضرورت ہے عہد حاضر میں سرسید کی معنویت کو قائم کیا جا سکتا ہے۔ اگر ہم ان اقدام اور ایسے اعمال کو اپنے مسائل کے حل کا ذریعہ بنائیں جن کے ذریعہ ان خادمان قوم نے اپنے وقت کے مسائل کا حل تلاش کیا تھا۔ اس وقت اس کی ضرورت اور بڑھ جاتی ہے جب مسائل اور حالات ویسے ہی ہوں جیسے حالات اس خادمان قوم کے وقت تھے۔ موجودہ حالات کا اگر ہم مشاہدہ کریں تو بہت سے امور میں ہمیں یکسانیت نظر آتی ہے سرسید نے جو خواب دیکھا اس کی مکمل تعبیر اب ہمارے سامنے ہے۔ سرسید کا طریقہ کہ انھوں نے اپنی قوم کے سماجی، سیاسی اور دیگر شعبوں کو بہتر بنانے کے لئے اپنی تمام توجہ حصول تعلیم کی طرف مبذول کر دی اور اپنے مقصد کو حاصل کرنے کے لیے علمی و عملی طور پر اپنی انتھک کوششیں صرف کر دیں۔ نورالحسن نقوی کے الفاظ میں:

''سرسید نے بے عملوں کو جدوجہد پر آمادہ کیا، گوشہ نشینوں کو کھلی فضا میں سانس لینا سکھایا، ماضی کے پرستاروں کو حال کی جانب متوجہ ہونے کی تلقین کی، مشرق کے پجاریوں کو مغرب کی خوبیوں سے روشناس کیا، تقلید پرستوں کو اجتہاد کی اہمیت سے واقف کرایا، دنیا کو بے حقیقت سمجھنے والوں کو دنیا میں نیکی کمانے اور آخرت کے لیے توشہ جمع کرنے کا راستہ دکھایا، غرض انھوں نے سوتوں کا جگایا، مردہ دلوں میں جان ڈالی اور ہندوستانی مسلمانوں کو زندہ قوموں کی طرح زندگی گزارنے اور سر بلند کر جینے کا سلیقہ سکھایا۔''

یہی سلیقہ آج ہمیں پیدا کرنا ہے چونکہ سرسید کی ہی تعلیمات سے ہمارے مستقبل کی راہیں روشن ہو سکتی ہیں۔ بہر حال معاشرے میں مذہبی ہم آہنگی اور انسانی اخوت و محبت کے رشتوں کو زیادہ مضبوط کرنے کے ضمن میں بھی سرسید کے عملی اصول ماضی کی طرح حال میں بھی موثر اور کارگر ثابت ہو سکتے ہیں۔

❑❑❑

حواشی۔

1۔ ماہ نامہ تہذیب الاخلاق اکتوبر 2018 سرسید نمبر (شبلی روڈ علی گڑھ مسلم یونورسٹی علی گڑھ یو۔ پی۔)۔

2۔ جہات سرسید از شمس بدایونی ——

3۔ مقالات سرسید مرتبہ محمد اسماعیل پانی پتی

4۔ انتخاب مضامین سرسید مرتبہ آل احمد سرور

5۔ سرسید اور ان کے کارنامے از پروفیسر نورالحسن نقوی

عرفان لکھنوی
سیتاپور روڈ کھدرا، لکھنؤ- Mob.808187833

غزل

دل جو اک بار ٹوٹ جائے گا
عزمِ فنکار ٹوٹ جائے گا

میرے بچو! یہ ریت کا گھر ہے
بن کے ہر بار ٹوٹ جائے گا

دیکھنا میرے پیار کا جادو
زورِ انکار ٹوٹ جائے گا

تیشۂ عزم اس کے ہاتھ میں ہے
اب یہ کہسار ٹوٹ جائے گا

وہ سمجھتا ہے تیر و نشتر سے
اک قلم کار ٹوٹ جائے گا

جام اُٹھا احتیاط سے ورنہ
گر کے بیکار ٹوٹ جائے گا

مجھ کو عرفاؔن یہ اُمید نہ تھی
وعدۂ یار ٹوٹ جائے گا

●●●

نصیر احمد نصیؔر
بالاگنج، لکھنؤ- Mob.9305718961

غزل

دلوں میں پیار چہروں پر خوشی معلوم ہوتی ہے
یہ بستی وہ نہیں ہے دوسری معلوم ہوتی ہے

میں گھر سے آیت الکرسی کو دَم کر کے نکلتا ہوں
اندھیرے میں بھی مجھ کو روشنی معلوم ہوتی ہے

ابھی پردیس سے آئے مجھے کچھ دن ہی گذرے ہیں
ابھی سے کیوں محبت میں کمی معلوم ہوتی ہے

میں پورے گھر کی ذمہ داریاں کیسے اُٹھاؤں گا
یہ گٹھری میری وسعت سے بڑی معلوم ہوتی ہے

یہ دنیا چار دن کی ہے، خبر یہ کس نے پھیلائی
مجھے تو چند روزہ زندگی معلوم ہوتی ہے

وہ ایسے بات کرتی ہے کہ سب حیرت میں پڑ جائیں
مری بیٹی تو اب مجھ سے بڑی معلوم ہوتی ہے

نصیؔر اب وقت شاید آ گیا دُنیا سے جانے کا
یہ رات اب زندگی کی آخری معلوم ہوتی ہے

●●●

ڈاکٹر سیما صدیقی
راجہ جی پورم، لکھنؤ- Mob.8604608110

اردو انشائیہ اور بیسویں صدی کے اہم انشائیہ نگار

یوں تو اردو ادب اپنی کہکشاں میں اصناف کے کئی ستارے سمیٹے ہوئے ہے۔ انھیں میں سے ایک صنف ہے انشائیہ نگاری مغربی مصنف و انشائیہ نگار بیکن انشائیہ کی تعریف کرتے ہوئے کہتا ہے کہ:

''نثری اضاف میں انشائیہ ایک ایسی مختصر تحریر ہے جس میں بغیر کسی تجسس اور کھوج کے حقیقت کا اظہار ہو۔''

ہر صنف اپنا مقام رکھتی ہے اور اپنی ضرورت اور اہمیت منوا کر رہتی ہے اسی طرح انشائیہ کی بھی اہمیت و انفرادیت سے انکار نہیں۔ جب جب ادب بوجھل ہوتا جائے گا اور حالات کی چکی میں انسان پستا جائے گا اور اس کا جینا دوبھر ہوگا وہ کسی ناصح کی نہیں ہمدرد دوست کی ضرورت محسوس کرے گا۔ تب تب صنف انشائیہ کی ضرورت ہوگی۔

بقول ڈاکٹر عبادت بریلوی:

''سرسید اردو ادب کے سب سے پہلے انشائیہ نگار ہیں انھوں نے تہذیب الاخلاق نکالا اور تہذیب الاخلاق اردو انشائیہ نگاری میں سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔''

یوں تو اردو میں انشائیہ کی عمر سوا سو سال سے بھی زیادہ ہے۔ لیکن بحیثیت ایک منفرد صنف اردو انشائیہ اپنے تمام فنی محاسن کے ساتھ بیسویں صدی کی ابتدائی دہائیوں میں ابھر کر سامنے آتا ہے۔ انشائیہ نگاروں کی کھیپ سماج کی بہترین دوست ثابت ہوئی ہے۔ انشائیہ کی اہمیت اس لئے بھی روشن ہے کہ کہیں وہ نثری اظہار کی ایک ایسی صنف ہے جس میں حقیقت کا اظہار شخصی ردعمل، عدم تکمیل، رمزیت و اشاریت، غیر منطقی ربط، اختصار، دعوت فکر، مسرت بہم پہنچانے کی صلاحیت، زبان و بیان میں بانکپن اور مرکزی بات سے کچھ ضمنی باتوں کا ذکر کر کے مسائل کا حل، زندگی کی یکسانیت اور ٹھہراؤ سے اوپر اٹھ کر ماحول کا ازسرنو جائزہ لینے کی صلاحیت، غمگین دلوں کی شگفتگی کا سامان اور خشک خیالات کے گہرے اندھیرے میں جگنوؤں کی سی سبز روشنی کا مستحکم عصا۔ یہ ساری بنیادیں انشائیہ نگار اور قاری کے درمیان رابطے کے پل کا کام کرتی ہیں اور یہی پل اسے دوسری اصناف کی اہمیت میں سرفہرست رکھتا ہے۔

آج انسانی شعور پختگی اختیار کر گیا ہے۔ عوام کا معیارِ زندگی بھی بلند ہوگیا ہے۔ فہم و فراست نے بھی چند زینے مزید طے کر لئے ہیں اسی لئے انشائیے کے در پردہ اشارے کنایے ہر خاص و عام کے لئے قابل فہم ہوگئے ہیں۔

انشائیے نے نثر کو زر خیز کر دیا
جو نخل بو دیا اسے، گلریز کر دیا

انشائیہ ایک ہلکی پھلکی صنف ادب ہے تاہم اس میں زندگی کے متعلق بڑی گہری باتیں بتائی جاتی ہیں اور زندگی کی ناہمواریوں کی طرف توجہ دلائی جاتی ہے۔ اس مقصد کے لئے انشائیہ نگار ایک خاص اسلوب جس میں کسی قدر طنز کی آمیزش کے ساتھ ساتھ مزاح بھی ہوتا ہے۔ طنز کا پہلو بالکل کم ہوتا ہے۔ اس لئے کہ انشائیہ کا ایک بنیادی مقصد مسرت بہم پہنچانا بھی ہے اور مزاح کی زیادتی سے انشائیے میں سطحیت در آتی ہے۔ انشائیہ نگار کسی موضوع پر ہلکے پھلکے انداز فکر و فلسفے کے دقیق نکات بیان کر جاتا ہے اور اشاروں اشاروں میں معنویت کی تہہ داریاں کھولتا ہے۔

انشائیہ مضمون کی ہی ایک قسم ہے لیکن دونوں میں موضوع، زبان، ترتیب، ربط اور انداز بیان میں فرق ہے۔ بنیادی طور پر انشائیہ نگار کا مقصد سوچ کے لئے راستے ہموار کرنا ہوتا ہے۔ انشائیہ نگار کے ذہن میں موضوع سے متعلق یا موضوع سے جڑے خیالات جس طرح آتے ہیں وہ انھیں ضبط تحریر میں لے آتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انشائیے کے مختلف پیراگراف میں عام طور پر ایک نیا خیال ملتا ہے۔ اور تقریباً ہر پیراگراف اپنی جگہ مکمل ہوتا ہے۔ اس لئے انشائیے کو ''غزل کا فن'' بھی کہا گیا ہے جس طرح غزل کا ہر شعر اپنے آپ میں ایک مکمل خیال کی ترجمانی کرتا ہے، اسی طرح انشائیے میں بھی یہی خصوصیت نظر آتی ہے۔

بیسویں صدی آتے آتے انشائیہ نے ترقی کے کئی زینے طے کر لئے تھے اس دور میں انشائیہ نگاری کے موضوعات کو اخلاقی، سماجی، سیاسی اور خصوصاً دہلی کی تہذیب کے گرد گھومتے دیکھا گیا۔ مختلف انشائیہ نگاروں نے صوفیانہ انداز فکر اپنایا تو کسی نے فلسفیانہ نقطۂ نظر سے اس کے بال و پر سنوارے۔ بعض نے جمالیاتی حسن کی کارکردگی سے اپنے انشائیوں کے برگ و بار کو تراش کر خوبصورت بنایا۔ چند ایسے بھی تھے جنھوں نے حالات حاضرہ کا جائزہ اپنی تیسری آنکھ سے لیا اور تنقید و تبصرہ نگاری بھی جاری رہی۔ اکثر انشائیوں میں انداز بیان خوش طبعی کا تابع ہوتا نظر آیا جس سے عبارت میں شگفتگی اور لطافت میں کئی گنا اضافہ ہوتا گیا۔ کئی انشائیوں میں طنز کے نشتر اتنے شدید ہیں کہ مارے تکلیف کے منہ سے آہ نکل گئی لیکن درد کا احساس کم ہونے پر وہی آہ، واہ میں تبدیل ہوگئی۔ بہتوں کا طرز بیان استعاراتی ہے جس سے معنی و مطالب کے نت نئے پیرائے سامنے آتے ہیں۔ غرض یہ کہ بیسویں صدی کے تمام انشائیوں کے اسلوب کو اطلاعی، عراضی اور تخلیق کہا جا سکتا ہے۔

وزیر آغا کہتے ہیں:

''انشائیہ معنی خیز مسکراہٹ سے بہرہ ور ہوتا ہے۔ یہ مسکراہٹ اصلاً ایک عارفانہ مسکراہٹ ہے جو سدھارتھ کے ہونٹوں پر اس وقت نمودار ہوتی ہے جب

اس پر اچانک کائنات کا راز فاش ہو جاتا ہے اور مونا لیزا کے ہونٹوں پر اس وقت جب اسے اپنی تخلیقی حیثیت کا عرفان حاصل ہوتا ہے۔ انشائیہ نگار کو معنی خیز تبسم عطا کرنے کے اہم کام سے روک کر محض فقرہ بازوں اور لطیفہ گویوں کی صف میں لا کھڑا کرنا کفران نعمت نہیں تو اور کیا ہے؟۔''

یوں تو انشائیہ نگاروں کی فہرست بہت طویل ہے مختصر وقت میں سب پر روشنی ڈالنا ممکن نہیں اس لئے مقالہ کی مناسبت سے کچھ انشائیہ نگاروں کے طرز انداز کو پیش کرتی ہوں۔

شوکت تھانوی کو انشائیہ نگار کے طور پر کم اور مزاح نگار کے طور پر زیادہ جانا جاتا ہے۔ ان کے قلم میں بلا کی روانی تھی۔ روز مرہ کی باتوں اور آئے دن کے پیش آنے والے واقعات کو اس طرح بیان کرتے تھے کہ پڑھنے والا لوٹ پوٹ ہو جاتا تھا۔ اپنے واقعات میں ایسے دلچسپ نکتے پیدا کرتے تھے کہ بے اختیار لبوں پر ہنسی آجاتی۔ ظرافت کے ساتھ شوخی کی رسی کو مضبوطی سے تھامے رکھتے تھے۔ ان کی تحریروں کی سب سے بڑی خاصیت یہ تھی کہ اتنی مزاح و ظرافت کے باوجود کبھی کوئی ایسی بات یا فقرہ نہیں کہتے تھے کہ جس سے تہذیبی بداخلاقی نظر آئے۔ شوکت تھانوی کا شمار ان لکھنے والوں میں ہوتا ہے جن کو فطری طور پر مزاح نگاری کی حِس ملی ہو۔ ان کے پلاٹ پیچیدہ نہیں ہوتے تھے۔ روز مرہ کی زندگی کی معمولی باتوں پر تنقید کرتے تھے موجودہ حالات اور رسم و رواج پر تبصرہ کرتے تھے۔

ان کے انداز بیان کی دلکشی کی مدار ان کی بے ساختگی اور سادہ لوحی ہے۔ وہ ایسی تصویریں پیش کرتے ہیں کہ سنجیدگی سے پڑھنے والوں کے لب پر بھی تبسم آجاتا ہے۔ شوکت تھانوی نے تقریباً ۶۰ سے زائد کتابیں تصنیف کیں۔ سودیشی ریل، موج تبسم، امید تبسم، شیش محل، قاضی جی وغیرہ ان کے بہترین مضامین اور انشائیے ہیں۔

ان کی شگفتگی تحریر کا نمونہ پیش نظر ہے جو ان کے انشائیہ ''بابو'' سے لیا گیا ہے۔

''بابو ہندوستان کی اس مخلوق کو کہتے ہیں جو دفاتر میں فائلوں کی چہار دیواری کے درمیان ناک کی پھنگی پر عینک لگائے ہوئے کاغذ سیاہ کرتی نظر آئے اور اس کے متعلق دیکھنے والے کو نہایت آسانی کے ساتھ اندازہ ہو سکے کہ سائنس داں نے اپنے کمال سے ٹائپ کی طرح خط شکست لکھنے کی یہ انسانی صورت والی مشین ایجاد کی ہے جو پان بھی کھاتی ہے، عینک بھی لگاتی ہے۔ کبھی کبھی بات بھی کرتی ہے اور اکثر گھورتی بھی ہے۔''

کنھیا لال کپور کا نام کسی تعارف کا محتاج نہیں کنھیا لال کپور کی دور بین نگاہیں زندگی کے ہر مخصوص شعبے پر پڑتی ہیں۔ سیاسی، معاشرتی، علمی، ادبی خرابیوں کو نہایت حسین اور مزاحیہ انداز میں منظر عام پر لاتے ہیں۔ ان کی تحریر کے تخیل میں فلسفیانہ گہرائی نہیں پائی جاتی وہ کسی جماعت کے نظریہ سے متاثر ہو کر نہیں لکھتے بلکہ ہر بات اور ہر مسئلہ کو اپنے طور پر سماج یا فرد کی خرابیوں کو بے لوث ہو کر پیش کر دیتے ہیں۔ سماج کے کئی کرداروں کی حماقتوں کو بڑی سنجیدگی سے متعارف کراتے ہیں۔

باوجود متانت کے واقعات اور حالات کچھ ایسے سلیقہ سے سامنے لاتے ہیں کہ پڑھنے والا زیرلب مسکراہٹ پر مجبور ہو جاتا ہے۔ وہ اپنی تحریر میں خود ہنستے ہوئے نظر نہیں آتے بلکہ دوسروں کی کمزوریوں کا ماتم کرتے دکھائی دیتے ہیں۔لیکن اسلوب بیان کی شوخی اور بے باکی فضا میں ایسی لہر دوڑاتی ہے جو قاری کو بار بار گدگداتی اور چھیڑتی چلی جاتی ہے۔ وہ روزمرہ کی باتوں کو پیش کر کے اسلامی نقطۂ نظر پیدا کرتے ہیں۔ کنھیا لال کپور کی زبان ٹکسالی اردو کا نمونہ ہے۔ سکے کے دو رخ دکھاتے ہوئے کھوکھلے مذہبی نیتاؤں پر کپور صاحب کی اس کراری چوٹ کو ملاحظہ فرمائیے۔

''ہمارے مذہبی جنون اور جہالت کی یہ حالت ہے کہ ہم جاہل سے جاہل مولویوں اور پنڈتوں کے ہاتھوں میں کٹھ پتلی بننے کو تیار ہیں وہ جس طرح ہمیں نچاتے ہیں ہم نہ صرف ناچتے ہیں بلکہ ان کے اشاروں پر ناچنے میں فخر محسوس کرتے ہیں۔ کیونکہ مسجد کے سامنے ہندوؤں نے باجا بجایا ہے اس لئے وہ برے ہیں حالانکہ ابھی ابھی انگریزی پلٹن کا بینڈ قیامت برپا کرتا ہوا مسجد کے سامنے سے گزرا تھا۔ جس وقت مولوی صاحب نہایت انہاک کے ساتھ نماز ادا کر رہے تھے کیونکہ اس مسلمان نے گائے ذبح کی ہے اس لئے اس کی گردن اڑا دو حالانکہ ہر روز انگریزی چھاؤنیوں میں فوجیوں کے لئے ہزاروں گائیں ذبح کی جاتی ہیں اپنے وطن میں مذہبی پیشوا ہمیشہ مزے میں اور مذہب ہمیشہ خطرے میں ہوتا ہے۔''

(اردو طنز و مزاح، احتساب و انتخاب)

بیسویں صدی کے نصف آخر میں جن ادیبوں نے اردو ادب کے افق پر خود کو تابندہ کیا وہیں مشتاق احمد یوسفی کا نام بھی سرفہرست ہے۔ان کی تحریریں ان کی فنکارانہ پختگی کا ثبوت دیتی ہیں۔

مشتاق احمد یوسفی کا مغربی ماحول، ادب اور معاشرے کا مطالعہ کافی گہرا ہے۔ جس کے واضح اثرات ہمیں ان کی تحریروں میں جابجا ملتے ہیں لیکن اس میں وہ انفرادیت کا پہلو ہاتھ سے نہیں جانے دیتے۔ اپنے نئے تجربوں کی وجہ سے انھوں نے طنز کے میدان کو وسعت بخشی۔ یوسفی صاحب نے کبھی خود کو عالم و فاضل نہیں سمجھا۔لیکن اپنے معیار کو کبھی گھٹنے نہ دیا۔ان کی نظر انسانی مسائل کے باریک سے باریک پہلو تک پہنچی ہے وہ انسان کے پوشیدہ زخم کو محسوس کر کے کچھ اس انداز سے پیش کرتے ہیں کہ ہنسی کے ساتھ ساتھ آنکھیں اشکبار ہو جاتی ہیں۔ان کی تحریر کی دلکشی، بے ساختگی، روانی، الفاظ کا انتخاب، تراکیب کی ساخت اور تشبیہات و استعارات کا استعمال اور نرم و سبک الفاظ کا استعمال نغمگی و موسقیت پیدا کرتا ہے۔ان کا قلم جس کسی بھی چیز کو چھو جاتا ہے اس میں نئی تازگی پیدا کر دیتا ہے۔

ایک ادیب نے ان کے فن پر تبصرہ کرتے ہوئے ٹھیک ہی لکھا ہے کہ:

''ادنیٰ سے ادنیٰ بات کے کسی پہلو یا زاویہ پر ہلکی سی روشنی ڈال کر اس کی طرف ہم کو متوجہ کر کے چونکا دینا اور خود

معصومانہ انداز میں آگے بڑھ جانا یوسفی کے فن کی وہ نزاکت ہے جو انھیں کے حصے میں آئی ہے۔ان کے تاثرات ومنتخبات ان کی زبان ان کا اسلوب سبھی خود رفتہ اور خود بالیدہ ہوتے ہیں۔ان کا قلم جس کسی چیز کو چھو جاتا ہے اس میں نئی روئیدگی اور فنی بالیدگی پیدا کر دیتا ہے۔''

مشتاق احمد یوسفی موجودہ دور کے ان انشائیہ نگاروں میں شمار کئے جاتے ہیں جن کے انشائیے وسعت فکر، معلومات اور طنز ومزاح سے بھرے پڑے ہیں۔ان کا انداز بیان اتنا دلکش ہوتا ہے کہ پڑھنے والا ایک بار شروع کر کے پوری تحریر پڑھ کر ہی دم لیتا ہے۔

اپنی کتاب ''چراغ تلے'' کے مقدمے میں وہ خود رقمطراز ہیں:

''مجھے احساس ہے کہ اس ننھے سے چراغ سے نہ کوئی الاؤ بھڑک سکا نہ کوئی چتا دہکی۔ میں ہی جانتا ہوں کہ اپنی چاک دامنی پر جب اور جہاں ہنسنے کو جی چاہا ہنس دیا۔اب اگر آپ کو بھی اس ہنسی میں شامل کر لیا تو اس کو میں اپنی خوش قسمتی تصور کروں گا۔''

یوسفی صاحب کے انشائیوں میں قہقہوں کی پھلجھڑیاں لگاتار چھوٹتی رہتی ہیں اور قاری بڑی بے تکلفی اور یگانگت کے ساتھ ان کے لگائے قہقہوں میں شامل ہو جاتا ہے۔لیکن یہی قہقے لگاتے ہوئے جب یوسفی کی نظر سماج کے انتشار اور کھوکھلی قدروں پر پڑتی ہے تو طنز کا تیر اپنے ہاتھ میں لے کر کمان کھینچ لیتے ہیں اور یہی بات انھیں انشائیہ نگار سے طنز نگار بنا دیتی ہے،اس معاملہ میں خود یوسفی صاحب کہتے ہیں:

''طنز نگار راستے پر اترا اترا کر کرتب نہیں دکھاتے بلکہ تلواروں پر رقص کرتے ہیں۔''

ان کے انشائیوں میں انفرادیت اور انانیت کا فقدان پایا جاتا۔لیکن ان کے انداز اور گفتگو کا لہجہ انھیں منفرد بناتا ہے۔وہ روز ترہ کی تمام باتیں،روزمرہ کے طریقے یعنی عامیانہ طریقے سے ہی کرتے ہیں یہ چیز انھیں دوسرے فنکاروں میں ممتاز کرتی ہے۔ یوسفی ایک سلجھے ہوئے شگفتہ مزاج والے انسان تھے۔ان کے مزاج کی جھلک ان کی تحریروں میں صاف ملتی ہے۔ان کے لہجے کے اتار چڑھاؤ کے حسن کی مثال کہیں اور نہیں ملتی ۔وہ صحیح معنوں میں لہجے کے الفاظ کی پہنچ اور مزاج کو جانتے پہچانتے ہیں۔اس بات کی زندہ مثالیں ان کے انشائیے ''پڑیئے بیمار''،''صنف لاغر'' اور ''فنون لطیفہ'' ہیں۔

یوسفی صاحب کا سادہ اور دل لبھانے والا انداز ان کے انشائیہ ''سنہ'' میں ملاحظہ فرمائیے:

''سنہ عیسوی سے کہیں زیادہ مشکل ان تاریخوں کو یاد رکھنا ہے جن کے بعد قبل مسیح آتا ہے اس لئے کہ یہاں مورخین گردش ایام کو پیچھے کی طرف دوڑاتے ہیں۔ان کو سمجھنے اور سمجھانے کے لئے ذہنی شیش آسن کرنا پڑتا ہے۔ جو اتنا دشوار ہے جتنا الٹے پہاڑے سنانا۔اس کو طالب علموں کی خوش قسمتی کہیے کہ تاریخ قبل میلاد مسیح ،نسبتاً مختصر اور ادھوری ہے۔ اگر چہ مورخین کو شاں

ہیں کہ جدید تحقیق سے بے زبان بچوں کی شکل میں اضافہ کردیں۔ بھولے بھالے بچوں کو جب یہ بتایا جاتا ہے کہ روم کی داغ بیل ۷۵۲ قبل مسیح پڑی تو وہ ننھے منے ہاتھ اٹھا کر یہ سوال کرتے ہیں کہ اس زمانے کے لوگوں کو یہ کیسے پتہ چل گیا کہ حضرت عیسیٰ کے پیدا ہونے میں ابھی ۷۵۲ سال باقی ہیں۔''

اگر یہ کہا جائے کہ ایک فنکار ہے جس میں لفظوں کا فنکارانہ استعمال کرنے کی قدرت ہو۔ کرداروں کی نفسیات پر مضبوط گرفت ہو تو وہ کوئی اور نہیں صرف اور صرف مشتاق احمد یوسفی ہی ہوں گے۔

جیسا کہ زندگی نشیب وفراز کا دوسرا نام ہے۔ انشائیہ کی زندگی میں بھی بیسویں صدی کی تیسری دہائی میں ترقی پسند تحریک کے شروع ہونے سے انشائیہ کی صنف کو تھوڑا بہت نقصان ضرور پہنچا۔ ادب کے لئے یہ ایک انقلابی دور تھا۔ ادبا نے ظلم وستم کے خلاف آواز بلند کرنے کے ساتھ ایک با مقصد اور روشن زندگی کا خواب دیکھا اس مقصد کو پورا کرنے کے لئے انھیں اپنے تخلیقی افکار کا رخ سماجی تعمیرات کے لئے موڑ دینا پڑا نتیجہ کے طور پر انشائیہ کی روشنی مدھم نظر آنے لگی۔ لیکن اس کے بعد بھی انشائیہ کے گلوں کی خوشبو کم ہوتی ہوئی محسوس نہیں ہوئی۔ اپنی آزادروی کے باوجود انشائیے نے ادب کے مختلف گوشوں یعنی تاریخی، سیاسی، سماجی، جغرافیائی اور اخلاقی وغیرہ کا بخوبی احاطہ کیا ہے۔ اور انشائیہ نگاروں نے ادب کو بے انتہا قیمتی سرمایہ عطا کیا۔

❑❑❑

شبانہ عشرت
نزد شادی محل درگاہ روڈ، پٹنہ -Mob.7759882040

ساحرلدھیانوی

ساحر صرف اک نام نہیں ہے
دھوپ نہیں ہے، چھاؤں نہیں ہے
پھولوں کا شباب ہے ساحر
دلکش ہے، شاداب ہے ساحر
گیتوں کی البیلی دنیا
پریم نگر روپہلی دنیا
ساحر صرف اک نام نہیں ہے
دھوپ نہیں ہے، چھاؤں نہیں ہے
گیتوں کی برکھا رُت ساحر
ایک سجیلی مورت ساحر
اس کے سارے رنگ ہیں پیارے
سات سُروں کے نرمل دھارے
ساحر صرف اک نام نہیں ہے
دھوپ نہیں ہے، چھاؤں نہیں ہے
ٹوٹے دل کا ساز ہے ساحر
جیسے کوئی راز ہے ساحر
سب پر اس کا سحر ہے چھایا
سب کے دل کو ساحر بھایا
ساحر صرف اک نام نہیں ہے
دھوپ نہیں ہے، چھاؤں نہیں ہے
اپنے من کی بند آنکھوں سے
اب میں اس کو دیکھ رہی ہوں
کہنے کو تو صدیاں گزریں
پھر بھی اس کو سوچ رہی ہوں
ساحر صرف اک نام نہیں ہے
دھوپ نہیں ہے، چھاؤں نہیں ہے

ڈاکٹر مخمور کاکوروی
۶۸۔ چودھری محلّہ، کاکوری، لکھنؤ
Mob.9450097929

رشید قریشی: صحافت اور شاعری

(آمد : دسمبر ۱۹۴۴ء۔ رخصت : ۱۲ر مئی ۲۰۲۳ء)

کام کی بات کرو کام ہی سب کچھ ہے رشید
نام کیا پوچھتے ہو نام میں کیا رکھا ہے

رشید قریشی بہ یک وقت دو حیثیتوں کے مالک تھے ایک طرف جہاں وہ خوش فکر اور کم سخن شاعر تھے، وہیں دوسری طرف عہد حاضر کے ممتاز صحافیوں میں ان کا شمار ہوتا تھا۔ ان کے لئے اگر شاعری ادبی ذوق کی تسکین کا وسیلہ تھی تو صحافت ان کا ذریعۂ معاش تھا۔ وہ دونوں حیثیتوں سے منفرد شناخت رکھتے تھے۔

رشید قریشی نے ۱۹۷۷ء میں اپنے صحافتی سفر کا آغاز لکھنؤ سے شائع ہونے والے روزنامہ ''قومی آواز'' میں پروف ریڈر کی حیثیت سے کیا۔ اس اخبار میں رہ کر انھوں نے اختر یونس قدوائی اور حسن واصف عثمانی سے صحافت کے رموز و نکات اور نشیب و فراز کی واقفیت حاصل کی۔ روزنامہ ''آزاد ہند'' کلکتہ میں بھی پروف ریڈنگ کی خدمت انجام دی۔ روزنامہ ''انقلاب'' اور روزنامہ ''ہندوستان''، ممبئی میں بھی سب ایڈیٹر ادبی میگزین کی حیثیت سے کام کیا۔ روزنامہ ''عکاس'' کلکتہ کے لکھنؤ میں نامہ نگاری کے علاوہ روزنامہ ''صحافت''، لکھنؤ میں بھی سب ایڈیٹر رہے۔ ۱۹۸۸ء میں اپنی ادارت میں لکھنؤ سے ماہنامہ ''لاریب'' کا آغاز کیا اور نامساعد حالات کے باوجود مرتے دم تک اس رسالہ کی آبیاری میں اپنا خون جگر صرف کرتے رہے۔

رشید قریشی نے شاعر کے طور پر منفرد مقام حاصل کیا۔ ان کو نازش پرتاپ گڑھی اور فنا نظامی سے شرف تلمذ حاصل تھا، ان اساتذۂ سخن سے رشید قریشی نے بھرپور کسب فیض کیا۔ انھوں نے ہندوستان گیر پیمانہ پر مشاعروں میں اپنے فن کا مظاہرہ کرنے کے ساتھ بحرین اور کویت کے مشاعروں میں بھی شہر نگاراں لکھنؤ کی کئی بار نمائندگی بھی کی۔

ماہنامہ ''لاریب'' کو اردو حلقوں میں مقبول بنانے کے لئے رشید قریشی ہمہ وقت جدو جہد کرتے اس اردو کشی اور اردو خوری کے دور میں اردو کا کوئی رسالہ بغیر سرکاری امداد کے جاری رکھنا جوئے شیر لانے سے کم نہیں۔ رشید قریشی اپنے رسالہ کو مفید اور کارآمد بنانے کے لئے ہمیشہ کوشاں رہتے۔ انھوں نے چپراسی سے لے کر ایڈیٹر تک کے فرائض تن تنہا خود انجام دئے۔ رسالہ کمپوز کرانا، کاغذ خریدنا، پریس

میں چھپوانا اور پھر اس کو پوسٹ کرنے کے لئے ڈاک خانے کے چکر لگانا آسان کام نہیں تھا۔ ان کا رسالہ ’لاریب‘ ہندوستان کے مختلف شہروں کے علاوہ تقریباً دو درجن بیرونی ممالک میں بھی ذوق وشوق سے پڑھا جاتا رہا ہے۔

رشیدؔ قریشی نے ’لاریب‘ کے کچھ خصوصی شمارے بھی شایع کیے جن میں تسنیمؔ فاروقی نمبر، منصورؔ عثمانی نمبر، جاوید عرشیؔ نمبر، عبدالاحد سازؔ نمبر، نشورؔ واحدی نمبر، شعراے بھوپال نمبر، شعراے گجرات نمبر، کے. کے. سنگھ مینکؔ نمبر، عامرؔ قدوائی نمبر، ڈاکٹر طارق قمرؔ نمبر اور حسین امین نمبر قابل ذکر ہیں۔ ان خاص شماروں کی ادبی حلقوں میں خاطر خواہ پزیرائی بھی ہوئی۔

میں نے رشیدؔ قریشی کو پہلی بار تقریباً پچاس برس قبل ایک مشاعرہ میں دیکھا اور کلام سنا تھا، اس وقت تک میں صرف صاحب ذوق سامع تھا۔ شاعری کا آغاز نہیں کیا تھا۔ یہ مشاعرہ میرے پڑوس میں چودھری اظہر علی صدیقی عرف منجو میاں کی رہائش گاہ پر منعقد ہوا تھا۔ مقامی شعراء میں مرزا سکندر بیگ قدرؔ، سلطان باسط علوی بیکسؔ، منشی ظہیر الدین ظہیرؔ، عبد الرزاق فرہادؔ، انیس احمد گوہرؔ کے علاوہ شہر نگاراں لکھنؤ سے عرفانؔ صدیقی، شمسؔ فرخ آبادی، انجم ملیح آبادی، تسنیمؔ فاروقی، فہمی انصاری، کاشفؔ لکھنوی، حفیظؔ سلمانی اور رشیدؔ قریشی نے اپنا کلام پیش کیا تھا۔ مجھے رشیدؔ قریشی کی غزل کے دو شعر آج تک یاد ہیں آپ بھی ملاحظہ فرمائیں۔

ہم خانہ خرابوں کو محلوں کی ضرورت کیا
پتھر کے زمانے میں شیشوں کی ضرورت کیا
میں نے تو رشیدؔ اب تک بس اتنا ہی جانا ہے
اپنے کو بنانے میں اپنوں کی ضرورت کیا

رشیدؔ قریشی سے میری شناسائی برسوں سے تھی لیکن تعلقات اس وقت استوار ہوئے جب میں اردو اکادمی قیصر باغ، لکھنؤ میں امداد مصنفین کا کام دیکھ رہا تھا۔ اس زمانے یعنی ۱۹۹۰ء میں آج کی طرح فنڈ کی فراوانی نہیں تھی۔ رشید بھائی نے بتایا کہ انھوں نے ماہانہ امداد کے لئے درخواست دی تھی جو کسی وجہ سے نامنظور ہوگئی۔ میں نے ان سے وعدہ کرلیا کہ انشاء اللہ آئندہ میٹنگ میں منظور کرانے کی کوشش کروں گا۔ میں نے کوشش کی توان کے ساتھ اشرفؔ مالوی اور شارب کوثرؔ علوی کاکوروی کو بھی ۱۵۰/- روپے ماہانہ امداد منظور ہوگئی۔ اس وقت بہت سینئیر تخلیق کاروں کو محض ۵۰۰/- روپے ماہانہ امداد ملتی تھی۔ اب یہ رقم ۵۰۰۰/- روپے ماہانہ ہو گئی ہے۔ رشیدؔ بھائی ہمیشہ میرے احسان مند رہے اور اکثر اس حسن سلوک کا ذکر لوگوں سے کرتے تھے جس پر مجھے شرمندگی محسوس ہوتی تھی اور میں کہتا تھا رشید بھائی بہت پرانی بات ہوگئی اب اس کا ذکر نہ کیا کریں تو وہ کہتے تھے میں احسان فراموش نہیں ہوں۔

مجھے اپنا تحقیقی مقالہ ’’دردؔ کاکوروی حیات اور کارنامے‘‘ ۳۱ر دسمبر ۱۹۹۳ء تک لکھنؤ یونیورسٹی میں داخل کرنا تھا۔ وقت کی تنگی کے باعث کئی لوگوں سے مقالہ فیئر کرانے کی ضرورت پیش آئی۔ رشید صاحب کی رائٹنگ بہت خوبصورت تھی انھوں نے میری گزارش پر میرے مقالہ کا ایک باب بلا اجرت وقت مقررہ کے اندر لکھ کر میرے سپرد کردیا۔ اس کے لئے میں آج بھی ان کا احسان مند ہوں۔

رشید قریشی کو عام طور پر لوگ خشک مزاج کہتے تھے

جبکہ میرے ساتھ ان کا رویہ نہایت مخلصانہ تھا۔ انھوں نے مجھے ''لاریب'' کا معاون مدیر بنایا بعد میں مجلس مشاورت سے وابستہ کیا۔کبھی ان سے میرے تعلقات ناخوشگوار نہیں ہوئے۔رشید صاحب لاریب کے سرورق پر اپنا شعر شایع کرتے تھے کئی برس پہلے کی بات ہے بزم شمس لکھنؤ کے روح رواں ڈاکٹر معراج ساحل نے حمد یہ مصرع طرح دیا۔

تسلیم کر رہے ہیں سبھی برتری تری

نشست غالباً ۵؍تاریخ کو جو ہر فاؤنڈیشن امین آباد میں منعقد ہونی تھی میں پہلی تاریخ کو رشید قریشی سے ملنے گیا تو انھوں نے ''لاریب'' کا تازہ شمارہ مجھ کو دیا جس کے سرورق پر ان کا یہ شعر چھپا ہوا تھا۔

اہل ہنر بھی مان گئے ہیں ترا ہنر
تتلی کے پر میں دیکھ کے کاری گری تری

شعر دیکھ کر میں نے عرض کیا رشید بھائی طرحی کلام وقت مقررہ سے پہلے منظر عام پر لانا دیانت داری کے منافی ہے۔ اس لئے کہ اگر کسی کا شعر آپ کے شعر سے ٹکرا گیا تو آپ یہی کہیں گے کہ میرا شعر نظر سے گزرا ہوگا۔ چونکہ میں نے بھی تتلی کے تعلق سے شعر کہا تھا اس لئے ان کو سنانا ضروری سمجھا کہ کل کو میرے اوپر کوئی الزام نہ آئے۔ شعر آپ بھی ملاحظہ فرمائیں۔

تتلی کے رنگ و روپ کو جب دیکھتے ہیں ہم
حیرت میں ڈال دیتی ہے کاری گری تری

شعر سن کر رشید صاحب خوش ہوئے اور انھوں نے برجستہ کہا تمہارا شعر زیادہ اچھا ہے۔

جہاں تک رشید قریشی کی شاعری کا تعلق ہے وہ تقریباً نصف صدی کو محیط ہے اس کے باوجود ان کا سرمایۂ سخن بہت قلیل ہے۔ اس کا سبب شاید یہ رہا کہ وہ روش عام سے ہٹ کر شعر کہنا پسند کرتے تھے۔ ان کی زیادہ تر غزلیں پانچ، چھ، سات شعروں پر مشتمل ہیں۔ انھوں نے اپنے کلام کی اشاعت کی جانب بھی سنجیدگی سے توجہ نہیں دی۔ آخری عمر میں ایک شعری مجموعہ ''سوچ'' تیار کرایا تھا لیکن مستقل بیماری اور موت نے یہ خواب ان کی زندگی میں شرمندۂ تعبیر نہیں ہونے دیا۔

شاعری ایسا ملکہ ہے جو عطیۂ خداوندی ہوتا ہے۔ شاعر اپنے دلی جذبات کے ساتھ دوسروں کے افکار و خیالات اس طرح سے نظم کرتا ہے کہ وہ شاعر کے اپنے معلوم ہوتے ہیں۔ اس بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ شاعر خوددار اور اس کا ضمیر بیدار ہوتا ہے۔ اگر کسی کا ضمیر مردہ ہو جائے تو وہ حق پسندی اور حق بیانی سے کوسوں دور ہو جاتا ہے۔ ضمیر کی آواز کامیابی کی ضمانت ہوتی ہے۔ ضمیر کی اہمیت پر رشید قریشی کہتے ہیں۔

کسی فقیر سے پوچھو نہ پیر سے پوچھو
تم اپنے بارے میں اپنے ضمیر سے پوچھو
کامیابی کا پا گیا وہ سراغ
جس نے سن لی ضمیر کی آواز

شاعری کے بارے میں تقریباً ہر شاعر اپنے نظریہ کی وضاحت شعروں میں کرتا ہے خود رشید قریشی کا خیال ہے کہ شعر دیرپا ہونا چاہیے قلم کار کو اپنے زمانے کے حقائق بیان کرنے کی ضرورت ہوتی ہے اگر وہ ایسا نہیں کرتا تو وہ قلمکار نہیں ہوسکتا۔ شاعر کے پاس نظر کے ساتھ نظریہ ہونا لازمی ہے سچائی لکھنے والا قلمکار ہی لفظوں میں جان ڈال سکتا ہے۔

اشعار کہتے وقت رہے ذہن میں رشید
وہ شعر شعر ہی نہیں جو دیر پا نہ ہو
جو اپنے زمانے کے حقائق نہیں لکھتا
وہ اپنے زمانے کا قلمکار نہیں ہے
ہمارے شعر روایت سے مختلف ہیں رشید
ہمارے پاس نظر بھی ہے اور نظریہ بھی
لفظوں میں جان ڈالنا آساں نہیں رشید
سچائی لکھنے والا قلم کار بھی تو ہو

ہندوستان جیسے ملک میں اتحاد و اتفاق بہت ضروری ہے صرف گلے ملنا کافی نہیں دلوں کا ملنا ضروری ہے۔ وقت سے جاگنا ضروری ہے کیوں کہ صبح کے بعد اندھیرا ہوگا۔ تھک کر بیٹھ جانے والوں کو تمام عمر منزل مقصود نہیں ملتی ۔

ہم گلے مل رہے ہیں صدیوں سے
دل سے دل آج تک ملے ہی نہیں
ابھی تو وقت ہے جاگو ابھی سویرا ہے
ابھی نہ جاگے تو آگے بہت اندھیرا ہے
تھک کر جو بیٹھ جاتے تو روتے تمام عمر
چلتے رہے تو منزلِ مقصود پا گئے

یہاں پر اپنی پسند کے کچھ اشعار پیش کر رہا ہوں جو آپ کی بھی پسندیدگی کا باعث ہوں گے ۔

بیکار کوئی شے ہو تو بے نام رہو گے
خوشبو ہو تو دنیا کو خبر ہو کے رہے گی
کچھ لوگ اپنے نقش قدم چھوڑ بھی گئے
کچھ لوگ صرف نقش قدم دیکھتے رہے
وہ لوگ جن کے ارادوں میں جان ہوتی ہے
وہ آسماں کو زمیں پر اتار لاتے ہیں

دنیا سرائے فانی ہے یہاں ہمیشہ کسی کو رہنا نہیں ہے ،اس لئے انسان کو ایسا کچھ کر کے جانا چاہیے کہ دنیا یاد رکھے۔ سربلندی کا سبق شاہین کے بچوں سے سیکھنے کی ضرورت ہے جس پیڑ میں پھل ہوتے ہیں اس کی شاخیں زمین کی طرف جھکی ہوتی ہیں اور خالی برتن بہت آواز کرتا ہے ۔

یہاں کچھ نقش اپنے چھوڑ جاؤ
یہاں تا دیر تو رہنا نہیں ہے
اونچائیاں چھونے کی جس کو بھی تمنا ہو
پرواز کا فن سیکھے شاہین کے بچوں سے
جو کچھ نہیں ہے وہ ایڑی اٹھا کے چلتا ہے
جو سر بلند ہے اس میں غرور کچھ بھی نہیں

رشید قریشی نے اپنی زندگی صحافت اور شاعری کے لئے وقف کر رکھی تھی جیتے جی وہ ادب کی خدمت کرتے رہے مگر جس طرح سے ان کی خدمات کا اعتراف ہونا چاہیے تھا نہیں ہوا۔ اگر ان کو شاعری نہیں تو صحافت کا بڑا ایوارڈ ملنا چاہیے تھا مگر افسوس ایسا ممکن نہیں ہوسکا۔ دبستان اہل قلم لکھنؤ نے ۱۹؍مارچ ۲۰۲۳ء کو ان کی ادبی اور شعری خدمات کے اعتراف میں ''ڈاکٹر صوفی بستوی ایوارڈ'' سے نوازا تھا لیکن ریشد قریشی بیماری کے باعث اس پروگرام میں نہ آسکے تھے۔ جناب طارق سخا کے ذریعہ ایوارڈ ان کے گھر بھیجا گیا تھا۔ رشید قریشی کی گراں قدر خدمات ان کو ادب میں زندہ رکھنے کے لئے کافی ہیں۔ میں انھیں کے شعر پر اپنی بات ختم کرتا ہوں ۔

آدمی اپنی کوششوں سے رشید
اپنی قسمت بدل بھی سکتا ہے

❑❑❑

اسرائیل علی سفیرؔ مانچوی
مانچہ کمھریا، ہمیر پور-Mob.9793522959

غزل

دعائیں ہم نے بہت کیں مگر اثر نہ ہوا
ہمارے حال سے لیکن وہ بے خبر نہ ہوا

جلے ہزاروں مکاں آتش تشدد میں
خدا کا شکر ہے ویران میرا گھر نہ ہوا

اٹھائے پھرتے ہیں کاندھوں پہ اپنا گھر لیکن
دل و دماغ کبھی اپنا در بہ در نہ ہوا

یہ نظم و ضبط کے ہم زاویے بدل نہ سکے
ہوس کی وادی میں اپنا کبھی گزر نہ ہوا

وہ جس کو ڈھونڈتے رہتے ہیں ہم سمندر میں
وہ دستیاب ہمیں آج تک گہر نہ ہوا

وہ جانتا ہے ہے مری عادتوں کی فہمائش
مجھے بھی ملنے میں اس سے کوئی حذر نہ ہوا

سفیرؔ اس کی نگاہوں کی بات ہے کچھ اور
کہیں بھی ایسا تو دنیا میں جادوگر نہ ہوا

●●●

محبوبؔ خیر آبادی
خیر آباد، سیتاپور-Mob.9580579100

غزل

سفینۂ غم ہستی کا امتحاں آیا
نظر کے سامنے پھر بحر بیکراں آیا

کمال سحر تھا لفظ و بیاں میں کیا تیرے
جو تیری بزم سے آیا وہ بے زباں آیا

چمن سے جاتے پرندوں کو کس طرح دیکھوں
کہ آج موسم گل صورتِ خزاں آیا

حد نگاہ میں رستہ نہ کوئی بھی منزل
غم حیات مجھے لے کے تو کہاں آیا

چمک اٹھیں مری آنکھیں برنگ کیف وطرب
دیارِ خواب کا میرے جہاں نشاں آیا

تمام زخم ہنسے صورتِ گل امید
مری نگاہ میں یہ کون مہرباں آیا

خلوصِ دل رہا شامل جہاں جہاں محبوبؔ
اثر زبان و بیاں میں وہاں وہاں آیا

●●●

محمد اویس سنبھلی

رابطہ:9794593055

رمن لال اگروال

میں فضاؤں میں اِک دن بکھر جاؤں گا

رمن لال اگروال ایماندار، بااخلاق ،باغ و بہار اور پروقار شخصیت کے مالک تھے۔عمدہ گفتگو کرتے تھے۔ان کے چہرے پر ہمیشہ مسکراہٹ بکھری رہتی تھی۔ان کی زندگی کا خاص وصف سادگی اور منکسر مزاجی تھا۔انھوں نے اپنی سادگی اور سادہ لوحی سے لوگوں کو خوب متاثر کیا اور خوب نقصان بھی اُٹھایا۔کلف لگا ہوا سفید کرتا پائجامہ ان کا پسندیدہ لباس تھا۔ لوگ ان سے محبت کرتے تھے اور وہ لوگوں سے محبت کرتے تھے۔ان سے ملنے اور بات چیت کرنے یا ان کے ساتھ گھل مل بھی جانے کے باوجود یہ سمجھ پانا مشکل تھا کہ یہی وہ شاعر ہے جس نے ''ذکرِ وفا'' میں دنیا کی بے ثباتی، اپنوں کی بے وفائی اور زمانے کی نیرنگیوں کا ذکر کیا ہے۔وہ ایک باغ و بہار، بذلہ سنج ،زندگی سے بھرپور متحرک شخصیت تھے۔۲رنومبر ۲۰۱۶ء کو انھوں نے اپنے اس شعر کو حقیقت کا جامہ پہنا ہی دیا ۔

زیست کا کوئی رمؔن بھروسا نہیں
میں فضاؤں میں اک دن بکھر جاؤں گا

لیکن رمن لال اگروال فضاؤں میں بکھر کر بھی اس لئے زندہ ہیں کہ انھوں نے پوری زندگی میں وفا کا ذکر کیا، حب الوطنی کا درس دیا، اتحاد و اتفاق کی راہیں ہموار کیں اور 'ذکرِ وفا' کے ہی ذریعہ انھوں نے اپنی ذات کے کرب کا بڑی کامیابی کے ساتھ اظہار کیا۔

کرونا کی دوسری لہر میں ان کی شریک زندگی محترمہ سیما رانی اگروال نے بھی دنیا کو الوداع کہہ دیا اور اپنے وفا شعار 'پتی دیو' کے پاس پہنچ گئیں۔رمن لال اگروال کی آنکھوں کی ٹھنڈک بیٹا شیل اگروال اور بیٹی اسرتی اگروال ان کے ادبی سرمایہ کو محفوظ رکھے ہوئے ہیں۔شیل اگروال سے اکثر ہماری ملاقاتیں ہوتی ہیں، ان ملاقاتوں میں شعر و ادب کا چرچا اس لیے نہیں ہوتا کہ انھیں اس میں بالکل دلچسپی نہیں ہے۔لیکن وہ ملتے بالکل رمن لال اگروال کے انداز ہی میں ہیں اور فی زمانہ یہ بھی بڑی بات ہے۔

اردو ادیبوں اور شاعروں کی فہرست کا جائزہ لیں تو اس میں بلاتفریق مذہب و ملت ابنائے وطن کے نام نظر آتے ہیں۔لکھنؤ میں اردو ادب کے منظرنامے میں بہت سے غیر مسلموں کی خدمات بڑی نمایاں رہی ہیں۔اسی زبان وادب کی وجہ سے جو تہذیب پروان چڑھی، اسے 'گنگا جمنی

تہذیب‘ کہا جاتا ہے۔ رمن لال اگروال اسی ’گنگا جمنی تہذیب‘ کے پروردہ اوراس کے نمائندہ تھے۔

رمن لال اگروال سے میرا پہلا تعارف بڑے بھائی جاوید نعیم صاحب کے توسط سے ہوا۔ بھائی صاحب خریداری کے ارادے سے ایک دن رمن لال اگروال کی دکان پر گئے۔ بھائی صاحب کے لہجے میں تھوڑی بہت لکھنویت اس لیے آچکی تھی کہ وہ ایک طویل عرصہ سے لکھنؤ میں ہی مقیم تھے۔ انہوں نے اپنے ابتدائی اورانتہائی تعلیمی مراحل لکھنؤ ہی میں طے کیے تھے۔ بھائی صاحب کے انداز گفتگو سے رمن لال اگروال اس قدر متاثر ہوئے کہ انھوں نے اپنے چند اشعار سنائے۔ بھائی صاحب چونکہ اس معاملے میں کافی بے ذوق واقع ہوئے ہیں، اس لیے انھوں نے رمن لال اگروال سے یہ کہتے ہوئے چھٹکارا پالیا کہ ’ہمارے چھوٹے بھائی کوشعروادب کا خوب ذوق ہے، ہم کل انھیں آپ کے پاس بھیجتے ہیں‘‘۔

بھائی صاحب نے یہ پورا واقعہ ہمیں سنایا اور کہا کہ کل کسی وقت ان کے پاس چلے جانا۔ اگلے ہی دن رمن لال اگروال سے ہماری تفصیلی ملاقات ہوئی۔ انھوں نے اپنا پورا ’کچا چٹھا‘ ہمارے سامنے رکھ دیا۔ اپنی ذاتی ڈائری سے ہمیں بہت سے اشعار سناتے ہوئے اس خواہش کا بھی اظہار کیا کہ وہ اپنا کلام کتابی شکل میں شائع کرانا چاہتے ہیں۔ ہم نے ان سے اس کام کا وعدہ کرلیا۔ وہ اپنے کلام کو ہندی میں کمپوز بھی کرا چکے تھے۔ ہندی کا مسودہ گذشتہ چند ماہ سے ڈاکٹر شاکر ہاشمی صاحب کے پاس رکھا تھا۔ ڈاکٹر صاحب اپنی بے پناہ مصروفیتوں کے سبب اس مسودے کو نہیں دیکھ سکے تھے۔ خیر! یہ مسودہ پھر ہمارے پاس آیا۔ پہلے اردو میں اس کی کمپوزنگ کرائی گئی، پھر اس کی اصلاح کا مرحلہ آیا۔ اصلاح کے معاملات ڈاکٹرمخمور کاکوروی سے طے کرادیئے گئے۔ رمن لال اگروال کے کلام پر اصلاح کے بعد مخمور کاکوروی نے مسودہ واپس کردیا۔ رضوان فاروقی کے مشورے سے اس مجموعہ کا نام ’’ذکرِ وفا‘‘ رکھا گیا۔ فاروقی صاحب نے ہی بہترین خطاطی کا مظاہرہ کرتے ہوئے سرورق کا ’’ذکر وفا‘‘ لکھا۔ کتاب خوبصورت انداز میں طبع ہوکر منظر عام پر آئی۔ حفیظ نعمانی اور رضوان فاروقی کی قیمتی تحریروں نے کتاب کی وقعت میں اضافہ کیا۔ بحیثیت مرتب اس ناچیز کی بھی ایک مختصر تحریر اس کتاب میں شامل رہی۔ ۱۳رفروری ۲۰۱۰ء کو میزبان ہوٹل میں رضوان فاروقی نے کتاب کی رسم اجراء کی تقریب کا اہتمام کیا۔

رمن لال اگروال نے ’’پہلی کوشش‘‘ کے عنوان سے ایک مضمون کتاب کے لیے لکھا۔ اس مضمون میں انھوں نے اپنی شاعری کے متعلق کسی طرح کا کوئی دعویٰ نہیں کیا، بلکہ پرکھ اور نقد ونظر کی ساری ذمہ داری صاحبان علم و دانش کے کاندھوں پر ڈال دی۔ وہ تحریر کرتے ہیں:

> ’’...روزمرہ کی عام زندگی میں جو کچھ نظر آتا ہے، تاجرانہ زندگی کے جو تجربے اور مشاہدے ہیں، انھیں میں اپنے علم اور استعداد کے مطابق اشعار کے قالب میں ڈھالنے کی کوشش کرتا ہوں۔ اب وہ شاعری ہے یا کچھ اور

یہ اہل ادب بتائیں.....میں نے تو بس اپنے جذبات ، اپنے احساسات اور خیالات کو کسی طرح دو مصرعوں میں پرو دیا ہے اور قطعاً دعویٰ نہیں یہ کس لائق ہے''۔

''ذکرِوفا'' کے لیے حفیظ نعمانی صاحب نے ''وفاؤں کا طالب: رمن لال اگروال'' کے عنوان سے بہت قیمتی مضمون لکھا۔اس مضمون سے چند سطریں یہاں نقل کی جاتی ہیں:

''میرے سامنے ایک کتاب ''ذکرِوفا'' رکھی ہے۔ یہ ایک شعری مجموعہ ہے جو رمن لال اگروال کی غزلوں کا مجموعہ ہے...رمن لال اگروال برتنوں کے سوداگر ہیں، چار نسلیں تانبہ، پیتل ، المونیم اور اسٹیل کا وزن کرتے گذاری ہیں۔انھیں نہ شاعروں کی چلم بھرنے کا وقت ملا ہوگا، نہ مشاعروں میں رات بھر واہ واہ! سبحان اللہ اور مکرّر ارشاد! کی گردان کا اور نہ اُن کا حلقہ ایسا ہوگا کہ جس میں کہا جاتا ہے کہ ''آپ بھی ارشاد فرمائیں'' اور پھر کچھ اپنا کلام سنایا ہوگا...

رمن کے کلام کو اگر فن عروض کی کسوٹی پر کسا جائے تو اس میں کمی نہیں، کمیاں نکلیں گی، اشعار میں ضرورت شعریت کے لیے بھی جگہ جگہ پیوند لگے محسوس ہوتے ہیں لیکن یہ تمام چیزیں اس جذبہ کی وجہ سے دب جاتی ہیں، جس نے اس مجموعے کی اشاعت کا خرچ اُسے برداشت کرنے پر آمادہ کیا، جو حساب میں ایک پیسہ کی غلطی تلاش کرنے کے لیے ایک روپے کا تیل جلا دینے والوں کی گود کا پروردہ ہے۔''

حفیظ نعمانی صاحب نے جب یہ مضمون لکھ کر دیا تو ہم نے کمپوز کرنے کے بعد اسے رمن لال اگروال کو سنایا۔ وہ اس مضمون کو سن کر بہت خوش ہوئے۔فوراً اسے ہندی میں کمپوز کرایا، بعد میں ہمیں بتایا گیا کہ وہ اپنے یہاں آنے والے ہندی کے ادیبوں اور کویوں کو پکڑ پکڑ کر اسے سناتے تھے۔اس مضمون کے بعد وہ حفیظ صاحب سے ملنے ان کے گھر بھی جانے لگے تھے۔

رضوان فاروقی نے رمن لال اگروال کی شاعری اور سمت و رفتار پر تفصیل سے روشنی ڈالتے ہوئے لکھا کہ:

''رمن لال اگروال کے کلام سے انسانیت کی خوشبو پھوٹتی ہے...عشق و محبت کی چھوٹی بڑی اینٹوں پر حسن و محبت کے گارے سے کمالِ صناعی کے ساتھ، سنجیدگی و متانت کی ''کنّی'' سے غزل کی عمارت تعمیر کرنے کا جذبہ رکھنے والے رمن لال اگروال اپنی شاعری کی دھنک رنگ کیفیتوں سے بغض و نفرت کے سینہ کو چیر کر اتحاد و اتفاق کے پرسوز نغمات

سے فضا کو خوشگوار بنانے کا عزم رکھتے ہیں اور فخریہ کہتے ہیں۔

جان جائے مجھے غم نہیں
ہم ترے ہو کے بس رہ گئے
رمّن کو اب بھی اپنی محبت پہ ناز ہے
تم باوفا تھے یار! ابھی کل کی بات ہے

یہاں تک تو ذکر اس کا ہوا کہ کس طرح رمن لال اگروال سے ہماری ملاقات ہوئی اور اس ملاقات کے نتیجے میں ان کا مجموعہ کلام ''ذکر وفا'' شائع ہوا تو اہل علم و دانش نے اس کی کیسی پذیرائی کی۔ رمن لال اگروال کا یہ مجموعہ ہندی میں بھی ''ذکرِ وفا'' کے نام سے ہی شائع ہوا۔ اس ہندی ایڈیشن کا اجراء رام لیلا گراؤنڈ میں واقع آڈیٹوریم میں اس وقت کے میئر پروفیسر دنیش شرما اور ڈاکٹر شاکر ہاشمی کے ہاتھوں ہوا۔ ڈاکٹر مخمور کاکوری بھی اس تقریب میں شریک ہوئے۔

''ذکرِ وفا'' کی اشاعت اور اس کے اجراء کی تقریب کے ذریعہ لکھنؤ کے بہت سے ادیبوں اور شاعروں سے رمن لال اگروال کا تعارف ہوا۔ لکھنؤ کی ادبی تقریبات میں انھیں بلایا جانے لگا، کچھ عرصہ گزرا کہ مہمان خصوصی کی حیثیت سے ادبی دعوت ناموں میں ان کا نام نظر آنے لگا۔ وہ بہت تیزی سے آگے بڑھتے جارہے تھے۔ کئی مرتبہ ہم نے انھیں سمجھانے کی کوشش بھی کی، لیکن اب انھیں شہرت راس آنے لگی تھی اور ان کا کاروبار بھی اس شہرت میں ان کا معاون بن گیا تھا۔ محض ایک مومنٹو اور ایک شال کے عوض وہ 'مہمان خصوصی' بنائے جانے لگے تھے۔ مومنٹوز کا اُن کا بڑا کاروبار ہے۔ لکھنؤ سے باہر کی ادبی محفلوں کا بھی وہ حصہ بننے لگے تھے اور خوب پیسے خرچ کرنے لگے تھے۔ لوگوں نے بھی خوب فائدہ اُٹھانا شروع کردیا تھا۔ ایک صاحب نے تو ان سے یہاں تک کہہ دیا کہ آپ کی کتاب جامعہ ملّیہ اسلامیہ دہلی کے نصاب کا حصہ بننے جارہی ہے۔ وہ سادہ لوح اس پر بھی یقین کر بیٹھے۔ چونکہ یہ ان کا میدان نہیں تھا، اس لیے انھوں نے نقصان بھی اُٹھایا۔ لیکن لوگ باگ اس بات سے بالکل ناواقف تھے کہ وہ اگر کسی کو ایک شال یا مومنٹو یا کچھ رقم دیتے تھے تو اس کو اپنی ڈائری میں اس کے نام اور دیگر تفصیلات کے ساتھ لکھ لیا کرتے تھے۔ ہمیں بھی ان کی ڈائری دیکھنے کا اتفاق ہوا تھا۔ کیا کہا جائے! اپنا ہی سر شرم سے جھک جاتا ہے کہ محض پانچ سو یا زیادہ سے زیادہ ایک ہزار روپئے یا اتنے ہی روپئے کے سامان کے لئے ہم نے خود کو کتنا گرالیا۔ یہ صرف اردو والوں کا حال نہیں تھا بلکہ ہندی کے نام نہاد ادیب و شاعر اور محض ۲۰-۲۵ کی تعداد میں چھپنے والے ہندی اخبار کے ذمہ داروں کا بھی یہی حال تھا۔ چھوٹے چھوٹے اخبارات کے ذمہ دار اُن کی ایک ''کویتا'' کی اشاعت پر اُن سے پانچ سو روپئے بآسانی لے جاتے تھے۔ وہ اپنا فوٹو اور کویتا اخبار میں دیکھ کر خوش ہوتے رہتے، اپنے گراہکوں کو دکھاتے اور سناتے رہتے، اسی کے ساتھ کاروباری عمل بھی جاری رہتا۔

رمن لال اگروال ۳۰/جون ۱۹۴۷ء کو لکھنؤ کے ایک

کاروباری گھرانے میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد کا نام چمن لال اگروال تھا۔ انہوں نے ۱۹۶۲ء میں گردھاری لال سنگھ انٹر کالج، اشرف آباد سے ہائی اسکول اور ۱۹۶۳ء میں کرسچین کالج لکھنؤ سے انٹرمیڈیٹ کا امتحان پاس کیا ہی تھا کہ محض ۴۸/ برس کی عمر میں ان کے والد کا انتقال ہوگیا، جس کے سبب انہیں تعلیم کا سلسلہ منقطع کرنا پڑا۔ والد کے کاروبار کی ساری ذمہ داری انہی کے ناتواں کاندھوں پر آگئی۔ جب کاروبار کے گن سیکھ لیے تو ماحول کو جمالیاتی نظروں سے دیکھنے کا بھی موقع ملا اور ۱۹۷۳ء سے شاعری میں دلچسپی پیدا ہوئی اور ۱۹۷۴ء سے باقاعدہ شعر کہنے لگے۔ تقریباً ۴۰/ برس تک یہ سلسلہ جاری رہا۔ ۳/ نومبر ۲۰۱۶ء کو شیل اگروال نے اُن کے 'سورگ واس' کی افسوس ناک خبر سنائی تو میری حیرت کی انتہا نہ رہی۔ چند روز قبل ہی تو رمن صاحب سے ملاقات ہوئی تھی، وہ کسی طور پر بھی بیمار نظر نہیں آرہے تھے۔ بہرحال موت کا ایک دن متعین ہے، اس سے کسی حال میں بچنا ممکن نہیں۔ رمن لال اگروال بھی سب کچھ چھوڑ کر دنیا سے رخصت ہوگئے۔

جس طرح موت ایک حقیقت ہے اسی طرح ایک حقیقت یہ بھی ہے کہ جانے والے کبھی لوٹ کر نہیں آتے۔ آفتاب اقبال شمیم نے کہا ہے ؎

یہ ہجرتیں ہیں زمین و زماں سے آگے کی
جو جاچکا ہے اسے لوٹ کر نہیں آنا

❑❑❑

تخلیق کاروں سے گذارش

اپنی تخلیقات/نگارشات صفحہ کے ایک طرف ہی لکھیں۔ ہر تخلیق پر غیر مطبوعہ کی تصدیق ہونا لازمی ہے۔

ای۔میل سے بھیجی ہوئی تخلیقات/نگارشات کی ہارڈ کاپی جس پر آپ کا پتہ اور موبائل نمبر صاف صاف درج ہو، بھیجنے کی زحمت کریں۔

جو تخلیقات کسی وجہ سے شائع نہیں ہوں گی، ان کی واپسی کے لئے اکادمی ذمہ دار نہیں ہوگی۔

تخلیقات کے ساتھ بینک اکاؤنٹ میں درج نام، بینک کا نام، شاخ کا نام، آئی۔ ایف۔ ایس۔ سی نمبر انگریزی میں لکھ کر بھیجنا ضروری ہے۔ پاس بک کی فوٹو کاپی یا کینسل چیک بھی منسلک کرنے کی زحمت کریں۔

اتر پردیش اردو اکادمی بچوں کے مزاج و معیار کے لحاظ سے

ماہنامہ **باغیچہ**

پورے آب وتاب کے ساتھ شائع کر رہی ہے۔ اس کے فروغ اور توسیع کے لئے آپ کا تعاون درکار ہے۔

۱۔ آپ اپنی تخلیقات بھیج کر

۲۔ خود خریدار بن کر اور دوسروں کو ترغیب دے کر

۳۔ بچوں میں اردو رسائل پڑھنے کا ذوق بیدار کر کے

اردو کی خدمت کر سکتے ہیں۔

عطیہ پروین

سید پور، ردولی، ایودھیا-Mob.9696783987

ہم جس دن موجود نہ ہوں گے

آج وہ تخت خالی ہوگیا تھا جو اماں کا ٹھکانہ تھا۔ اماں کبھی کبھی ایک ٹھنڈی سانس لے کر مگر مسکرا کر بہو بیگم سے کہتیں ''کچھ روز اور برداشت کر لو بہو بیگم! ایک دن ہوگا جب یہ احساس ہوگا ہائے کہاں گئے وہ لوگ جو جان نچھاور کرتے تھے۔'' پھر ایک لمبی اور ٹھنڈی سانس بھر کر کہتیں۔

''ہم جس دن موجود نہ ہوں گے ہم کو اس دن یاد کرو گے۔''

''یاد نہیں تو سب۔ بہو بیگم ہونٹوں ہی ہونٹوں بدبداتیں، میرا دل باغ باغ ہوگا بڑی بی۔''

اماں ابھی کانوں سے معذور نہیں ہوئی تھیں سن لیتیں ایک ٹھنڈی سانس بھرتیں اور کبھی کا بڑی محنت سے سیا ہوا بٹوہ اٹھا کر کھولتیں اور تھوڑی چھالیہ نکال کر تبرک کی طرح پھانک لیتیں بس اپنے آپ کو تسکین دینے کے لئے منہ اس طرح چلاتیں جیسے خالی چھالیہ نہ ہو بلکہ پپر منٹ بھی ہے، الائچی کے دانے بھی ہیں، تھوڑا کتھا اور چونا بھی ہے، مزیدار پان بھی ہے جبکہ پان یا الائچی کا نام ونشان نہ ہوتا۔ خرچہ کم کرنے کے لئے بہو بیگم نے پان، الائچی، کتھے چونے پر پابندی لگا دی بس چھالیہ منگا کر دے دی جاتی، وہ بھی چھالیہ کے نام پر رنگے ہوئے کھجور دانے گنتی کے چھالیہ کے دانوں کے ساتھ ہوتے۔ اماں خوب سمجھتیں مگر سوائے ایک ٹھنڈی آہ کے کچھ نہ کہتیں۔ کھانے کا بھی یہ حال تھا جب سارا گھر کھانا کھا لیتا تو ایک تھالی میں ذرا سی دال یا گوشت پکا ہو تو چمچہ بھر سالن میں ایک چٹکی جیسی بوٹی اور دو روٹی اماں کے سامنے رکھ دی جاتیں اور بہو بیگم ٹنا خے دار آواز میں بولتیں۔

''لو کھا لو! پیسے جوڑ کے بڑی مشکل سے گوشت منگایا ہے۔''

سوائے ایک ٹھنڈی سانس کے اماں کچھ نہ کہتیں بس ایک نظر سامنے لگے میاں کے خوبصورت فوٹو پر ڈال کر زیر لب اتنا ہی کہتیں ''قیصر کے ابا! جانے کی اتنی جلدی تھی تو مجھے لائے کیوں تھے۔''

پھر چونک کے اور ڈر سے ادھر ادھر دیکھتیں کہ کسی نے سنا تو نہیں مگر پوتا یہ بڑبڑاہٹ سن لیتا تھا ہنس کر ماں کو آواز دیتا۔

''امی دڈا کچھ بول رہی ہیں دادو کے فوٹو سے''

''ارے ان کے پاس اور کام ہی کیا ہے محلے والوں سے دکھڑے نہیں رو پاتیں تو میاں کی تصویر ہی سے شکایتیں جڑا کرتی ہیں عاجز ہوگئی ہے طبیعت اللہ کی قسم'' بہو بیگم دانت پیس کر بولتیں۔

ہر دوسرے روز نہا کر عطر حنا میں ڈوبی رہنے والی اماں اب مہینے میں ایک یا دو بار اس وقت نہلائی جاتیں جب بدن پر میل کی تہیں چڑھ جاتیں اور بدبو کے بھبھکے اڑنے

لگتے۔وہ بھی خود دلہن بیگم ہاتھ نہ لگاتیں گھر میں برتن صاف کرنے والی بوا سے دس بیس روپے دے کرنہلوائی جاتیں۔

اور پھر بار بار وہ پیسہ فضول خرچ ہو جانے پر افسوس کیا کرتیں۔بس اور کیا کہا جائے زندگی نہیں تھی ایک بے حد کڑوا امتحان تھا جوختم ہونے پہ نہ آتا تھا۔اور پھر یہ امتحان اس روز ختم ہوا جب کڑاکے کی سردی میں اماں کو بوا کے ہاتھوں رات بھر کے برف جیسے پانی سے نہلا دیا گیا۔اماں تھرتھر کانپیں آخر میں اکڑ کر ختم ہوگئیں۔بہو بیگم لحاف میں گھسی ہیٹر سے ہاتھ تاپتی رہیں۔ انہیں خبر بھی نہ ہوتی اگر بوا چلا کے ان کو مخاطب نہ کرتی۔

''ارے بہو بیگم! لگتا ہے اماں گزر گئیں۔''

بہو بیگم کی مسکراہٹ روکے نہ رک رہی تھی ۔زبردستی منہ پر آنچل باندھ کر اپنی بے پناہ مسکراہٹ اور مسرت کو چھپاتی اماں کے پاس آئیں وہ بھی بہتے ہوئے ٹھنڈے پانی سے اپنے کو بچانے کی کوشش کرتی ہوئی۔اماں کسی لکڑی کی طرح اکڑی ہوئی تھیں اور ان کی آنکھیں کھلی تھیں،منہ بھی کھلا تھا۔ڈر کر چلائیں۔

''ارے کمبخت ماری ان کی آنکھیں تو بند کر دی ہوتیں لگتا ہے ابھی نگل جائیں گی۔''

''اب کیا نگلیں گی موت نامراد نے ان کو خود نگل لیا ہے۔اصل میں بوڑھا کمزور بدن اور پھر موا برف جیسا ٹھنڈا پانی۔''بوا کی بات سن کر بہو بیگم نے کھا جانے والی نظروں سے اس کو دیکھا۔

''خبردار جو کچھ بولی منہ توڑ کے رکھ دوں گی۔''

بہو بیگم بڑی ناگواری کے ساتھ خود کو بچاتی اماں کا پلنگ پکڑوا کر تخت کے قریب لائیں۔برف کی سل جیسی ٹھنڈی اماں کو کسی ناگوار بوجھ کی طرح تخت پر ڈال دیا گیا اور جھلنگا پلنگ کوٹھے پر ڈال دیا گیا۔اب مصیبت یہ تھی کہ خبر سنتے ہی لوگ آنا شروع ہو جاتے جلدی سے دروازہ بند کر دیا گیا۔اور دنیا کو اماں کا یہ حلیہ نہ دکھانے کے لئے انتظام ہونے لگے تیزی کے ساتھ تخت پر سے گندی سیلی بدبودار دَری ہٹا کے موٹا صاف ستھرا گدا اور سفید چادر ڈال دی گئی۔نرم پھول دار غلاف کا تکیہ سر کے نیچے رکھا گیا۔کھینچ کھینچ کے کرتا اور پاجامہ پہنایا گیا پوتا جلدی سے سینٹ کی بوتل اور پاؤڈر کا ڈبہ لے آیا اکڑی ہوئی اماں پر پاؤڈر چھڑک کر سینٹ کا چھڑکاؤ کیا گیا اور بال سلجھا کر اس بستر پر لٹا دیا گیا جس کے لئے وہ ترستی چلی گئی تھیں۔پھولدار نرم کمبل بھی اڑھایا گیا تھا بالکل گڑیا سی لگ رہی تھیں اماں۔تخت کے نیچے بہو بیگم نے اپنی نئی چپل بھی لا کے سجادی تھی اور ان کی پھٹی ہوئی چپل کوڑے کے ڈرم میں ڈلوا دی گئی تھی پھر جلدی سے اس کائی لگے مکھیاں بھنکتے ایک اسٹول کو جس پر المونیم کا گلاس اور کائی لگی صراحی رکھی تھی اس کو ہٹا کر پالش سے جگمگاتا اسٹول رکھ دیا گیا اور اس پر نیا واٹر کولر اور جھمجھماتا گلاس سجا دیا گیا۔واہ کیا ٹھاٹھ تھے اماں کے۔ان کی روح یہ اہتمام دیکھ کرخوش ضرور ہوئی ہوگی۔یہ ان کے پوتے کا خیال تھا۔اب اطمینان ہوا اس تام جھام سے تو اماں کے چیکٹ کپڑے بھی چھت کے ایک کونے میں ڈال دئے گئے پھر دروازہ کھول کر اعلان ہوا۔

''قیصر میاں کی اماں گزر گئیں۔''

لوگوں نے آنا شروع کر دیا۔قیصر میاں چپ چاپ

یہ سب تماشا دیکھ رہے تھے تابعدار شوہر نے ڈر کے مارے اماں کی نذر ایک آنسو بھی نہ کیا۔ بس پرسہ دینے والوں کو ٹھنڈی آہیں سناتے رہے۔ اب جن بی بیوں نے اماں کی بری گت دیکھی تھی وہ آنچل اور شال میں منہ چھپا چھپا کر ہنسی روکنے کی کوشش کر رہی تھیں۔ جنھوں نے یہ بری گت نہیں دیکھی تھی وہ آنکھیں مسل مسل کر آنسو بہانے کی ناکام کوشش میں مصروف تھیں۔ اور بہو بیگم واہ کیا بات تھی آنکھوں میں گلسرین ڈال کر دھاروں دھار آنسو بہاتی۔

''ہائے میری اماں! ہائے میری اماں کی دلدوز چیخیں مارتی اماں کے اوپر بار بار گری پڑ رہی تھیں۔ بی بیاں مسکراہٹ چھپاتی ایک دوسرے کو کہنی مار مار کر کہہ رہی تھیں۔

''واہ بھئی۔ بہو تو ایسی۔ بیٹی بھی ماں کی میت نہ یوں روشن کرتی جس طرح بہو کر رہی ہے''۔ خدا خدا کر کے یہ ڈرامہ ختم ہوا، اماں گھر سے رخصت ہوئیں سب لوگوں نے پڑوس سے آیا ہوا کھانا رو رو کر مگر پیٹ بھر بھر کر کھایا اور سکون کی گہری سانس لے کر آرام کرنے لیٹ گئے۔ بہو بیگم کو اس بات کا سخت افسوس تھا کہ نیا بستر نیا کمبل جگمگ کرتا گلاس نیا واٹر کولر اماں کے لئے رکھی گئیں نئی چپلیں یہ کمبخت بوا لے گئی۔ وہ رات بہو بیگم کی بڑے آرام سے گزری۔ اللہ نے اماں کا کانٹا نکال دیا تھا۔ صبح خالی تخت دیکھ کر بہو بیگم کو اتنا سکون ملا کہ زندگی میں کبھی نہ ملا ہوگا۔ میاں کے دفتر جاتے ہی اس لئے کہ دفتر جانا ضروری تھا، بہو بیگم نے جلدی سے مٹی کے تیل کی بوتل اور ماچس اٹھائی ان کا بیٹا اور اماں کا پوتا جو کبھی کبھی ان کی خبر لے لیا کرتا تھا سامنے نہیں تھا ٹی وی دیکھ رہا ہوگا۔ بہو بیگم نے سوچا اور جلدی سے کوٹھے پر چڑھ گئیں اماں کے کپڑے اور ان کا جھلنگا پلنگ ان کو کاٹے کھا رہا تھا۔ جلدی جلدی آگے بڑھیں تو یہ دیکھ کر حیران رہ گئیں ان کا بیٹا ظہیر اماں کے بدبودار اور چیکٹ کپڑے گٹھری کی طرح باندھ کر رکھنے کے بعد اب ان کے جھلنگے پلنگ کی ادوائن کس رہا تھا۔ بہو بیگم کے ہاتھ سے مٹی کے تیل کی بوتل اور ماچس گر گئی جو وہ اماں کے کپڑے اور پلنگ کو جلانے کے لئے لائی تھیں حیرت بھری آواز میں انھوں نے پوچھا۔

''یہ کیا کر رہے ہو ظہیر؟ اس گندے پلنگ کی ادوائن کیوں کس رہے ہو؟ پاگل ہو گئے ہو کیا؟''

''نہیں اماں۔ دَدا کا خالی تخت دیکھ کر دل بھی ایک دم خالی ہو گیا ہے آپ کی محبت سے.....''

''کیا مطلب؟'' پھنسی پھنسی آواز میں وہ چلائیں۔

''اماں جب آپ بھی کبھی دَدا کی طرح ہو جائیں گی تو میری بیوی بھی ایسا ہی سلوک آپ کے ساتھ کرے گی اور میں ابّا کی طرح چپ چاپ یہ دیکھتا رہوں گا اور یہ پلنگ اس وقت آپ کے کام آئے گا۔ تخت پر ابو آرام کریں گے اور اس تخت پر آپ لیٹیں گی اور میں دیکھتا رہوں گا۔''

یہ کہہ کر وہ اس بے دردی سے ہنسا کہ بہو بیگم کانپنے لگیں پھر کھڑے قد سے فرش پر گریں۔ ظہیر پر کوئی اثر نہ ہوا اماں کے پلنگ کی ٹوٹی ادوائن کو گرہ لگا کر باندھنے کے بعد کستا رہا اور گنگناتا رہا بالکل ددا کی آواز میں آنسوؤں سے بھری تھرتھراتی اور کانپتی آواز میں۔

''ہم جس دن موجود نہ ہوں گے.......''

بہو بیگم حیران پھٹی پھٹی آنکھوں سے نیلے آسمان کو تکتی رہیں۔

□□□

R. No. 25039/72
U.P. Urdu Akademi
Khabarnama
उ.प्र. उर्दू अकादमी ख़बरनामा
اُتر پردیش اُردو اکادمی خبرنامہ
Vol. No. 52 October 2023 Issue No. 4

اتر پردیش اردو اکادمی کی اسکیمیں

اردو طلباء کو وظائف ☆ اشاعت کتب ☆ صوبے کے رجسٹرڈ عوامی کتب خانوں /دارالمطالعوں کو مالی امداد ☆ اردو ادباء کو مجموعی ادبی خدمات اور اردو کتب پر انعامات ☆ مسودات کی طباعت کے لئے مالی امداد ☆ مصنفین کو ماہانہ مالی امداد ☆ اردو کتابت اسکول ☆ اردو کوچنگ سینٹر ☆ اردو کمپیوٹر سینٹر ☆ اردو کی مطبوعات کی فروخت ☆ سہ ماہی ''اکادمی'' اور ماہنامہ ''خبرنامہ'' کی اشاعت ☆ سیمینار سمپوزیم اور مشاعروں کا انعقاد ☆ اقلیتی طلباء کو ''سول سروسیز کی تیاری کے لئے اردو آئی-اے-ایس-اسٹڈی سینٹر'' اور ماس کمیونیکیشن اینڈ میڈیا سینٹر۔

یونیورسٹی سطح کی نصابی کتابیں

نمبر شمار	نام کتاب	مصنف	قیمت	نمبر شمار	نام کتاب	مصنف	قیمت
1-	ادب پارے (نثر)	سید احتشام حسین	45/=	10-	انتخاب منظومات (حصہ دوم)	مجلس مشاورت	55/=
2-	ادب پارے (نظم)	سید احتشام حسین	45/=	11-	'' نثر (حصہ اول)	مجلس مشاورت	62/=
3-	انارکلی	امتیاز علی تاج	43/=	12-	'' نثر (حصہ دوم)	مجلس مشاورت	78/=
4-	انتخاب افسانہ	مجلس مشاورت	134/=	13-	بکٹ کہانی	نورالحسن ہاشمی	45/=
5-	'' خطوط غالب	مجلس مشاورت	28/=	14-	لازمی نصاب	حکم چند نیر	46/=
6-	'' غبار خاطر	ابوالکلام آزاد	70/=	15-	معیاری نثر و نظم	حامد ندیم	73/=
7-	'' قصائد	مجلس مشاورت	64/=	16-	منتخب غزلیں	مجلس مشاورت	135/=
8-	'' مراثی	مجلس مشاورت	120/=	17-	منتخب نظمیں	مجلس مشاورت	60/=
9-	'' منظومات (حصہ اول)	مجلس مشاورت	54/=				

شخصیات سیریز

نمبر شمار	نام کتاب	مرتب	قیمت	نمبر شمار	نام کتاب	مرتب	قیمت
1-	ملک زادہ منظور احمد	انور جلال پوری	438/=	10-	سالک لکھنوی	پروفیسر مظفر حنفی	216/=
2-	ندا فاضلی	پروفیسر علی احمد فاطمی	278/=	11-	متین طارق باغپتی	ڈاکٹر ذکی طارق	216/=
3-	کلیم عاجز	// مناظر عاشق ہرگانوی	288/=	12-	پروفیسر قمر رئیس	پروفیسر توقیر احمد خاں	245/=
4-	زبیر رضوی	ڈاکٹر مہتاب امروہوی	262/=	13-	ڈاکٹر اسعد بدایونی	حسیب سوز	245/=
5-	نشتر خانقاہی	اسد رضا	260/=	14-	حفیظ میرٹھی	ڈاکٹر تابش مہدی	245/=
6-	ساغر خیامی	ناشر نقوی	215/=	15-	عابد سہیل	ڈاکٹر صبیحہ انور	245/=
7-	مظہر امام	امام اعظم	208/=	16-	جوگیندر پال	ڈاکٹر اسلم جمشید پوری	287/=
8-	سید حامد	ڈاکٹر عبید اقبال عاصم	233/=	17-	معراج فیض آبادی	ڈاکٹر کلیم قیصر	245/=
9-	پیغام آفاقی	خان محمد آصف	224/=				

اکادمی کی مطبوعات کی خریداری و دیگر تفصیلات کے لئے رابطہ کریں

سکریٹری، اتر پردیش اردو اکادمی، وبھوتی کھنڈ، گومتی نگر، لکھنؤ-226010
سیلس ڈپو-موبائل نمبر 7081007078
Website:www.upurduakdemi.org E-mail:upurduakademi3@gmail.com